باب ششم

تقسیم ہند کے فسادات اور انجمن کی ہجرت

(نوشتہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مدظلہم)*

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

دلی جو ۱۸۵۷ء کے بعد سے کس مپرسی کی حالت میں پڑی تھی ۱۹۱۱ء میں یکایک اس کی قسمت جاگی اور وہ اعزاز جو قدرت نے اس کی تقدیر میں لکھا تھا، انہیں کی ہاتھوں اسے ملا جنھوں نے اسے محروم کیا تھا۔ یعنی ایک جُگ گزرنے کے بعد یہ سدا بہار بستی ایک بار پھر سلطنت ہند کی راج دھانی بنی۔ جس طرح شاہجہان نے ایک نئی دلی تعمیر کی تھی اسی طرح انگریز نے بھی ایک نئی دلی بسائی۔ اور عالیشان عمارتیں، سڑکیں اور بازار بنائے اور جی بھر کے دل کی حسرت نکالی۔ دلی والوں نے کبھی اسے اچھی نظر سے نہ دیکھا اور ہمیشہ اس کا ذکر حقارت سے کیا۔ اور لطف یہ ہے کہ یورپ کے بعض ماہرین فنون لطیفہ جب کبھی یہاں آتے اور پرانی دلی کی سیر کرکے نئی دلی پہنچتے تو وہاں کی دوغلی اور بدہیئت عمارتوں کو دیکھ کر انہیں بڑی مایوسی ہوتی۔ شاہجہان کی عمارتوں میں جو حسن، تناسب، دل کشی اور سبکی نظر آتی ہے وہ نئی دلی کی عمارتوں میں مفقود ہے۔ نئی دلی باہر والوں کا کمپو بن گئی۔ اگرچہ ۵۷ء کے بعد دلی کے ساتھ حکومت نے بڑی

---

* یہ پورا باب جناب مولوی صاحب نے اپنی یادداشتوں سے تحریر فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ ان سے بہتر اسے کوئی نہ لکھ سکتا تھا۔ انجمن کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھنے کے علاوہ یہ باب تقسیم ہند کے فسادات کا تاریخی مطالعہ کرنے والوں کے واسطے بھی نہایت مفید ہوگا۔ س۔ ہ

ناانصافی کی تھی بلکہ طرح طرح سے اسے ذلیل کیا تھا تو بھی اس کی مقبولیت میں فرق نہ آیا تھا اور لوگ اسے اسی شوق اور محبت بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ اس کی تہذیب اصل تہذیب اور اس کی زبان مستند زبان سمجھی جاتی تھی۔ دارالحکومت بننے کے بعد یہ سارے ملک اور ہر جماعت و ملت کا مرجع ہوگئی۔ جگہ جگہ کے لوگ یہاں آکر بس گئے۔ آبادی بڑھنے لگی۔ آئے دن کانفرنسوں، جلسوں، کمیٹیوں، کمیشنوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ تقسیم کے بعد جو دہشت ناک اور وحشیانہ قتل و غارت اور فسادات ہوئے اس کی نظیر اس ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اب مغربی پنجاب سے پناہ گزینوں کا ریلا آیا اور ساری دلی پر چھا گیا۔ یہاں کے قدیم شرفا یا تو مارے گئے یا بے سروسامانی کی حالت میں جان سلامت لے کر نکل بھاگے اور جہاں سینگ سمائے جا بسے۔ دلی نے بہت سے رنگ دیکھے ہیں۔ اس پر شان و شوکت اور بربریت کے بہت سے دور گزرے ہیں۔ لیکن یہ رنگ سب سے جدا ہے۔ دلی کی آبادی اب بیس لاکھ کے لگ بھگ پہنچ گئی ہے۔ اور ایسے ایسے لوگ آکر آباد ہوئے ہیں کہ ان کو دیکھ کر قدرت کا تماشا نظر آتا ہے۔ نہ معلوم دلی والے جو یہاں رہ گئے ہیں اپنے دل میں کیا کہتے ہوں گے۔ دلی کی تہذیب، اس کا تمدن، اس کی زبان، بول چال اور وضع قطع سب کا خاتمہ ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اب نئے لوگ نیا رنگ جمائیں گے۔ نئی زبان، نئی وضع قطع کا چلن ہوگا۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ ہڑبونگ دلی کی شان میں اضافہ کرے گی یا اسے بٹا لگائے گی۔ سچ ہے

تلک الایام نداولہا بین الناس

انجمن کے مکان میں یوں تو پہلے ہی سے مہربانوں اور مہمانوں کی آمد رہتی تھی لیکن جب دلی کی آبادی اور رونق اور اس کی اہمیت بڑھنے لگی تو ہمارے مہمانوں کی چہل پہل بھی پہلے سے بہت بڑھ گئی اور ہمارے کمرے بھرے پڑے نظر آتے تھے۔ ان میں لیگی بھی تھے اور کانگرسی بھی، خلافتی بھی تھے اور کمیونسٹ بھی، کونسلوں کے ممبر بھی تھے اور لیڈر بھی، اہل علم بھی تھے اور طالب علم بھی، گاندھی جی کے خاص معتقد اور چیلے بھی تھے اور ان کے مخالف بھی، ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہیں سیاست سے یا دوسرے کاروبار سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اگرچہ یہ مختلف خیالات اور مختلف اصول کے لوگ تھے۔ مگر

اردو کے بہی خواہ اور انجمن کے ہمدرد تھے اور جو جس سے بن پڑسکتا تھا وہ ہماری مدد کرنے میں دریغ نہ کرتا تھا ۔ اس لیے وہ مجھے سب عزیز تھے ۔ ان میں اور مجھ میں صرف ایک رشتہ تھا اور وہ رشتہ اردو زبان کا تھا ۔ ایک بڑی خوبی اس محبت میں یہ تھی کہ نہ میں ان کے معاملات میں دخل دیتا تھا نہ وہ میرے کام میں هارج ہوتے تھے ۔ میں بڑے اطمینان سے اپنا کام کرتا رہتا تھا ۔ اس لیے ان صاحبوں کا آنا مجھے کبھی ناگوار نہ ہوتا بلکہ بڑی خوشی ہوتی تھی ۔ اور ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ کام سے فارغ ہونے کے بعد ان سے باتیں اور گپ شپ کرنے میں بڑا لطف آتا تھا ۔ دن بھر کی تھکن اور کوفت دور ہوجاتی تھی اور دوسرے دن کام کے لیے ہشاش بشاش تیار ہو جاتا تھا ۔ کام کرنے والے کے لیے ایسی تفریح ٹانک کا کام دیتی ہے ۔ پھر ایسی صحبت ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتی ہے ۔ یہ خدا کی دین ہے ۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا تھا کہ ایسے اصحاب جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے کام میں خاص امتیاز رکھتا ہے میرے حال پر اس قدر مہربان ہیں اور اپنی مہربانی سے مجھے عزت بخشتے ہیں ۔ میں اُن کی اس عنایت اور محبت کو کبھی نہیں بھول سکتا ۔ اب ان دنوں کی یاد میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے ۔ خدا اُن سب کو خوش رکھے اور اُن کی عزت آبرو پر آنچ نہ آنے پائے ۔

جولای ۱۹۴۷ع کی ۱۴ تاریخ اور پیر کا دن تھا ۔ حسب معمول اپنے کمرے میں بیٹھا کام کررہا تھا ۔ دن میں کھانا کھاتا نہیں اس لیے بےتکان کام کرتا ہوں ۔ تیسرے پہر یکایک میرے ایک عزیز مہمان جو کئی روز سے ٹھہرے ہوے تھے میرے کمرے میں داخل ہوے اور کہنے لگے تیار ہوجائیے ، آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا ۔ میں نے کہا کہاں ؟ کہنے لگے حیدرآباد ۔ میں نے کہا ناممکن ۔ میرا بہت کام پڑا ہوا ہے میں اسے اس طرح چھوڑ کر نہیں جاسکتا ۔ کہنے لگے ، وہاں بھی تو آپ کا کام ہے اور میں انجمن ہی کے کام کی خاطر آپ کو وہاں لےجانا چاہتا ہوں ۔ انجمن کی امداد کا معاملہ درپیش ہے آپ کا وہاں رہنا نہایت ضروری ہے ۔ پھر ایسا موقع نہیں ملے گا ۔ حالات جلد جلد بدل رہے ہیں ۔ میں نے کہا یہ صحیح ہے ۔ میں ضرور حیدراباد جاؤں گا لیکن اس وقت نہیں چند روز کے بعد ۔ کہنے لگے میں آپ کا ٹکٹ

خرید چکا ہوں کل صبح ہوائی جہاز جاتا ہے تیار رہیے۔ ہرچند میں نے سمجھایا منایا مگر وہ نہ مانے۔ میں اس لیے بھی اُن کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا کہ وہ میرا ٹکٹ خرید لیتے ہیں اور رقم نہیں لیتے۔ میں اُن کے والد کا دوست ہوں یہ میرے سامنے کے بچے ہیں۔ لیکن انہوں نے میری اور انجمن کی ایسی محبت اور خلوص سے خدمت کی ہے کہ میں بعض اوقات اُن کی بات ماننے پر مجبور ہوجاتا ہوں۔ غرض میں تیار ہوگیا اور اپنے آدمی سے کہا کہ وہ ریل سے میرا سامان لے کر حیدرآباد آجائے۔ یہ ۱۰ جولائی منگل کا دن تھا۔

اُسی روز ہم دوپہر کے بعد حیدرآباد پہنچ گئے۔ وہاں مجھے رسالہ سائنس اور سائنس کمیٹی کے متعلق بعض معاملات طے کرنے تھے۔ اُردو لغات کی طباعت اور پروف ریڈر کے تقرر کے بارے میں بعض امور کا فیصلہ کرنا تھا جو ایک مدت سے زیر بحث تھے۔ نیز امداد انجمن کے متعلق جو بعض غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں اُنھیں رفع کرنا تھا۔ یہ امداد سر مرزا اسمعیل کی عنایت سے مسدود ہوگئی تھی۔ علاوہ اس کے ترقی و اشاعت اُردو کے لیے ایک لمیٹڈ کمپنی بنانے کا ارادہ تھا اس کے متعلق بعض کارداں اصحاب سے مشورہ کرنا اور اس کا خاکہ تیار کرنا تھا۔ ان تمام کاموں سے آخر اگست تک بہت کچھ فراغت ہوگئی۔ اب دلّی کا قصد کیا۔ ۳ ستمبر کی شام کو گرانڈ ٹرنک سے بھوپال روانہ ہوا۔ وہاں سے بذریعۂ ہوائی جہاز دلّی جانے کا ارادہ تھا۔ اس سفر میں سید علی شبر حاتمی میرے ہمراہ تھے۔ ۵ ستمبر کی شب کو بھوپال پہنچے۔ اسٹیشن پر میرے کرم فرما مہربان شعیب قریشی صاحب ملے۔ فرمایا یہاں سے کہاں جانے کا ارادہ ہے۔ میں نے کہا آپ کو لکھ چکا ہوں پرسوں دلّی روانہ ہوجاؤں گا۔ اُنہوں نے کہا دلّی کے حالات آج کل خراب ہو رہے ہیں ایسے وقت میں جانا خلاف مصلحت ہے۔ میں نے کہا اخبار والے ایسی خبریں لکھدیا کرتے ہیں آپ اس کا کچھ خیال نہ کیجیے۔ جولائی میں جب میں وہاں تھا تو اخباروں میں ہم اس قسم کی خبریں روزانہ پڑھا کرتے تھے۔ کہا کہ یہ اخبار والوں کی خبریں نہیں ہیں، میں جو کہہ رہا ہوں وہ واقعی کیفیت ہے اور مجھے یہ حالات معتبر ذرائع سے معلوم ہوئے ہیں۔ اس باب میں شعیب صاحب نے بڑی شدت سے اصرار کیا، میں ٹھیرنے پر رضامند نہ تھا اب وہ اصرار سے تشدد پر اتر آئے اور

فرمانے لگے آپ اس طرح نہ مانیں گے تو میں نواب صاحب سے کہہ کے آپ کے نام وارنٹ جاری کراکر گرفتار کرادوں گا۔ آخر یہ طے پایا کہ چند روز بھوپال میں قیام کر کے انتظار کروں۔ اگر وہاں کے حالات قابل اطمینان پائے جائیں تو شوق سے چلا جاؤں، ورنہ اس خیال کو ترک کردوں۔ تین چار روز ہی کے بعد جو خبریں آئیں وہ بہت ہی پریشان کن تھیں۔ جس ریل سے میں بھوپال آیا اسی میں حیدرآباد کے چند نوجوان طالب علم مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ جارہے تھے۔ ان میں سے جو دلی کے رستے گئے وہ رستے ہی میں قتل کردیے گئے۔ شعیب صاحب کا فرمانا صحیح نکلا۔

بھوپال میں پڑے پڑے بارہ روز ہوگئے تھے۔ ارادہ ہوا کہ دلی چلا جاؤں مگر شعیب صاحب کا اصرار تھا کہ ہرگز ادھر کا قصد نہ کیا جائے، حالات بہت خطرناک ہوگئے ہیں۔ ۱۸ ستمبر کو انجمن کے کارکنوں رحم علی الہاشمی صاحب اور حکیم رشید احمد صاحب کے خط پہنچے کہ بلوائیوں نے انجمن کے مکان پر حملہ کیا تمام سامان اور مال و اسباب لوٹ لیا اور غارت کردیا۔ سب ملازم وغیرہ جان سلامت لے کر بھاگ گئے ہیں۔ مکان کھلا پڑا ہے اور اللہ کی امان میں ہے۔ یہ خط پڑھ کر مجھے بیحد پریشانی ہوئی اور سخت رنج و افسوس ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ سید علی شبر حاتمی فوراً ہوائی جہاز سے دلی جانے کےلیے آمادہ ہوگئے۔ شعیب صاحب نے آنریبل مسٹر رفیع احمد قدوائی کے نام اور میں نے زاہد حسین صاحب، نواب زادہ لیاقت علی خاں، کرنل مجید ملک اور سر کلاڈ آکنلک کمانڈر ان چیف کے نام خط دئے۔ شعیب صاحب نے قدوائی صاحب کو ٹرنک کال سے بھی شبر کے دلی پہنچنے پر مدد دینے کےلیے کہا۔ یہ زمانہ بڑا خطرناک تھا۔ ۷ ستمبر کا دن جب میں دلی پہنچنے والا تھا مسلمانوں کے قتل عام کا دن تھا۔ اور اور اس وقت سے برابر مسلمانوں پر قیامت برپا تھی۔ قتل و غارت، لوٹ، عورتوں کی بے حرمتی، بے کس بڈھوں عورتوں اور معصوم بچوں کا بیدردانہ قتل اور ظلم و جبر کی کوئی وحشیانہ حرکت ایسی نہ تھی جو مجبور اور بے پناہ مسلمانوں کے ساتھ نہ کی گئی ہو۔ ایسے وقت میں وہاں جانا انتہائی جرأت اور ہمت کا کام تھا۔ دوسرا کوئی شخص ایسی ہمت نہ کرتا۔ یہ علی شبر کا دل گردہ تھا کہ وہ جان پر کھیل

کر بلا پس و پیش ۱۹ ستمبر کو دلی روانہ ہوگئے۔ ہوائی جہاز میں سوار ہوتے وقت ایک صاحب آئے اور انہیں ایک بقچیا دی کہ مہربانی کر کے میرے فلاں عزیز کو جو فلاں محلے میں رہتے ہیں پہنچادیجیے گا۔ انہوں نے مروت کے مارے لے لی۔ جب ولنگڈن ہوائی خانہ پر پہنچے اور وہاں کے ملازمین نے حسب دستور سامان کی تلاشی لی تو اس بقچیہ پر خون کے دھبے نظر آئے۔ اس سے کچھ شبہ ہوا۔ بقچیہ کھول کے دیکھی تو معلوم ہوا کہ کہ اس عقلمند شخص نے اور سامان کے ساتھ ایک مرغی بھی حلال کر کے رکھ دی تھی۔ ایسے وقت ایک عزیز کے لیے اس سے نادر تحفہ اور کیا ہوسکتا تھا!

ہوا خانے کی گاڑی مسافروں کو امپیریل ہوٹل تک پہنچا دیتی ہے۔ علی شبر جب یہاں پہنچے تو انہوں نے کوشش کی کہ ہوٹل میں ٹھیرنے کے لیے کوئی کمرہ مل جائے۔ ہوٹل کے منیجر نے کہا کہ کمرہ تو کوئی خالی نہیں البتہ بستر رات بھر آرام کرنے کے لیے مل سکتا ہے۔ ایک انگریز پاس کھڑا یہ گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے اشارے سے انہیں بلایا اور کہا یہاں ہرگز نہ ٹھیرنا۔ ہوٹل پر سکھوں کا قبضہ ہے اگر ٹھیرے تو قتل کیے جاؤ گے۔ اگر تمہیں کہیں اور جگہ نہ ملے تو میڈن ہوٹل چلے آؤ۔ میں نے ایک کمرہ لے رکھا ہے تم کو وہیں ٹھیرا لوں گا۔ انہوں نے اس نیک دل انگریز کا شکریہ ادا کیا اور کہا اگر اور ٹھکانا نہ ملا تو آپ کے پاس آ جاؤں گا۔ اب انہوں نے آنریبل مسٹر رفیع احمد قدوائی کو فون کیا اور اپنے آنے کی اطلاع کی۔ قدوائی صاحب نے جواب دیا ٹھیرے رہو، ابھی تھوڑی دیر میں سواری بھیجتا ہوں۔ کچھ دیر انتظار کے بعد قدوائی صاحب کی جیپ آئی جس میں دو مسلح سپاہی بھی حفاظت کے لیے موجود تھے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ان دنوں شہر کی کیا حالت تھی۔

اس دن تو رات ہوگئی تھی کہیں جا نہ سکتے تھے۔ دوسرے دن اسی جیپ میں مسلح سپاہیوں کی حفاظت میں نکلے اور سیدھے انجمن کے مکان میں پہنچے۔ یہاں کی بربادی کا سماں دیکھ کر بہت تاسف ہوا۔ ۲۲ ستمبر کو واپس آئے تو دلی کے کے قتل و غارت گری، سفاکی اور بربریت کا حال بیان کیا۔ سڑکوں اور گلیوں میں جابجا لاشیں پڑی ہیں۔ سینکڑوں، ہزاروں، مسلمان مرد، عورت اور بچے اپنا اپنا

سامان سروں پر اُٹھائے یا چھکڑوں میں لدے پرانے قلعے یا ھمایوں کے مقبرے کی طرف جارہے تھے - ان میں سے بہت سے رستے ھی میں ختم ھوگئے شبر صاحب پرانے قلعہ بھی پہنچے - وھاں کی جو درد ناک کیفیت بیان کی آسے سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ھو جاتے تھے - انجمن کے دفتر کا سامان رجسٹر کاغذات اور میرا تمام ذاتی سامان لوٹ لیا گیا - صرف بھاری فرنیچر جو آٹھا نہ سکے باقی رہ گیا مولوی سید ھاشمی کی موٹر توڑ پھوڑ ڈالی - کتب خانے کا ایک حصہ محفوظ تھا لیکن وھاں بڑی لٹیرے گھسے اور کتابوں کو تہ و بالا کیا - آسے یہ تفصیل سے نہ دیکھ سکے - مکان میں سب سے بڑا کمرہ وہ تھا جس میں میں کام کرتا تھا - اس میں کتابوں کی متعدد الماریاں تھیں - دو مقفل فولادی الماریاں تزیں جن میں نادر قلمی نسخے اور کاغذات محفوظ تھے ان کا کچھ حال معلوم نہ ھو سکا کیوں کہ مکان پر بھارت انشیورنس کمپنی کا قبضہ تھا اور سب کمروں میں ان کے کارکن کام کر رھے تھے - سب سے زیادہ المناک سانحہ یہ تھا کہ جب لٹیروں نے انجمن پر حملہ کیا تو جو ملازم اس وقت مکان میں رہ گئے تھے وہ ادھر آدھر بھاگ کر جان سلامت لے گئے - لیکن ھمارا ایک بڈھا کاتب اپنی جگہ سے نہ ھلا - ھر چند دوسرے ملازموں نے آسے ساتھ لے چلنے کے لیے کہا مگر وہ نہ مانا - اس کی بیوی علیل تھی اس لیے وہ وھاں سے نہیں جانا چاھتا تھا۔ ظالموں نے آسے اور اس کے بیوی بچوں کو بڑی بیدردی سے قتل کر ڈالا - یہ بہت قابل اور فرض شناس کاتب تھا اور اپنا کام خاموشی سے بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ کرتا رھتا تھا - اس واقعے سے میرے دل کو سخت رنج اور تکلیف ھوی - گاندھی جی آس زمانے میں دلی آگئے تھے اور قتل و غارت اور خونریزی اور باھمی منافرت کے جو شعلے بھڑک رھے تھے آن پر پانی چھڑکنے کی کوشش کر رھے تھے سید علی شبر نے آن سے ملنے کی بہت کوشش کی مگر آن کے حواریوں نے آن تک نہ پہنچنے دیا۔

اس وقت مجھے سب سے بڑی فکر آن کتابوں کی تھی جو میرے کمرے میں تھیں اور کتاب خانے کی جان تھیں - آن کی کیفیت معلوم نہ ھونے سے دل بے چین تھا میں چاھتا تھا کہ خود جاؤں اور دیکھوں کہ کیا گیا اور کیا رھا - کیا کھویا اور کیا بچا - لیکن شعیب صاحب اور دوسرے احباب سب مانع آئے کہ یہ وقت دلی جانے

کا نہیں - دھلی سے چودھری رحم علی الہاشمی اور حکیم رشید کے خط بھی اسی مضمون کے آئے - کہ وھاں جانا اپنے اپ کو ھلاکت میں ڈالنا ھے ناچار دل مسوس کے رہ گیا -

بھوپال میں خالی پڑے رھنا مناسب خیال نہ کیا - اتنے دن بھی جو وھاں لگ گئے تو وجہ یہ تھی کہ ملیریا نے آ دبوچا تھا - اچھے ھوتے ھی ۲۰ ستمبر کو حیدرآباد چل دیا - وھاں جو کام باقی رہ گیا تھا اسے سمیٹنا تھا - وھاں پہنچ کر کام شروع کیا - دو چار روز بعد جو ایک دن ڈاکٹر مظفرالدین قریشی سے ملنے گیا تو انہوں نے بڑی وحشت ناک خبر سنائی کہ خلیفہ عبدالحکیم کہتے تھے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کا خط مولانا مناظر احسن کے نام آیا ھے جس میں لکھا ھے کہ شہدائے دھلی میں مولوی سید ھاشمی کا بھی نام ھے - مجھے اس سے بڑی پریشانی ھوی - اس سے پہلے بھی فریدآباد خط اور تار بھیج چکا تھا مگر کوئی جواب نہ آیا - اب پھر میں نے جگہ جگہ خط اور تار بھیجنے شروع کیے - آل انڈیا ریڈیو دھلی کو بھی خط لکھا کہ شاید اس کے ذریعہ سے کوی اطلاع ملے لیکن کہیں سے کوی خبر نہ ملی - اس زمانے میں خطوں اور تاروں کی قدر اتنی تھی جتنی ردی کاغذ کی - بہت دنوں بعد ان کے ایک عزیز نے جو بھوپال میں ھیں اطلاع دی کہ سید ھاشمی زندہ و سلامت فریدآباد میں ھیں -

دلی ان دنوں مصائب و آلام کی آماجگاہ بنی ھوی تھی - قتل و غارت اور خونریزی کا بازار گرم تھا - جس کے سامنے نادر شاہ کا قتل عام اور غدر کے مظالم ھیچ تھے - ھندو اور سکھ خونخوار درندوں کی طرح مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے تھے - مسلمانوں نے اپنی بچاؤ کے لیے مقابلہ کیا اور خوب مقابلہ کیا - لیکن جب پولیس اور فوج بھی حملہ آوروں کے ساتھ مل گئی تو مسلمان بے بس ھو گئے اور ان کی ھمت ٹوٹ گئی - پھر جو وحشیانہ ظلم و ستم اور بربریت کا مظاھرہ ھوا اور معصوم اور شیر خوار بچوں اور عورتوں سے جس بےدردی اور سفاکی کا برتاؤ کیا گیا اس کی نظیر ھندستان کیا کسی ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی - یہ سب کچھ کسی اشتعال کی بنا پر نہیں بلکہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا تھا جس کا اعتراف خود پنڈت جواھر لال نہرو نے اپنی تقریر میں کیا اور کانگریسی اخبار نیشنل ھیرلڈ نے اس کی شہادت دی - اس اخبار کے دھلی کے نامہ نگار نے لکھا ھے کہ ھمیں بہت

پہلے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ایسا ہونے والا ہے لیکن یقین نہ آتا تھا اور جس کسی سے میں کہتا تھا وہ بھی یقین نہیں کرتا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ حملے سے ایک دن پہلے مسلمانوں کے مکانوں اور دکانوں پر نشان بنا دیے گئے تھے تا کہ ایسا نہ ہو کہ غلطی سے کسی ہندو کے مکان یا دکان کو نقصان پہنچ جائے۔ گاندھی جی کے عبادتی جلسے ان دنوں بھی جاری تھے۔ مسلمانوں کو ہدایت تھی کہ اپنے ہتھیار لا کر دے دیں۔ مظلوموں کے ساتھ تو یہ سلوک تھا لیکن ظالموں سے کوئی باز پرس نہ تھی۔ وہ اسی طرح مسلح تھے۔ اگر اس کا یہ مطلب تھا کہ مسلمان جب بالکل نہتے ہو جائیں گے تو ان پر کوئی ہاتھ نہ اٹھائے گا تو معصوم بچوں اور عورتوں پر جو ظلم کیا گیا وہ کس بنا پر تھا ان کے پاس کونسے ہتیار تھے۔ گاندھی جی کے عبادتی جلسوں میں نہ عبادت کا تقدس باقی رہا تھا اور نہ روحانیت کی روشنی۔ اب وہ جلسے کانگریس کا ادنیٰ درجہ کا سیاسی پروپیگنڈہ ہو کے رہ گئے۔ جونا گڑھ کے حملے کو انہوں نے جائز قرار دیا اور کشمیر کی حملہ آور فوجوں کو اپنی دعاؤں ساتھ روانہ کیا۔ وہ اہمسا جس کا غلغلہ سارے عالم میں مچا ہوا تھا اور جس کی بنا پر گاندھی مہاتما، مثل مسیح اور بدھ سمجھے جاتے تھے اس کا خاتمہ جمنا کے کنارے پر ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہ اصول نہ تھا بلکہ وقت کی مصلحت تھی جس کی حیثیت ایک سیاسی چال سے زیادہ نہ تھی۔ ۵ اکتوبر کو میں نے گاندھی جی کی خدمت میں اسی بارے میں ایک طویل خط لکھا اور اس کا انہوں نے جواب دیا۔ اس کا ذکر یہاں مناسب نہ ہوگا یہ کسی دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

میں حیدرآباد میں پڑے پڑے گھبرا گیا تھا اور دلی جانے کے لئے بے چین تھا۔ آخر ۲۴ اکتوبر کو بھوپال روانہ ہو گیا۔ وہاں سے میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے سکریٹری اجمل خاں صاحب کی خدمت میں خط لکھا کہ میں آنا چاہتا ہوں لیکن وہاں ٹھیرنے کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا اگر مولانا اجازت دیں تو چند روز ان کے دولت کدہ پر قیام کروں بعد میں کوی اور انتظام کر لوں گا۔ ان کا جواب آیا کہ مولانا نے بخوشی میرے قیام کی اجازت دیدی ہے ۸ نومبر کو سید علی شبر حیدرآباد سے دہلی روانہ ہوگئے اور میں ۹ نومبر کو۔ ہم مولانا کے مہمان رہے دوسرے دن یعنی ۱۰ نومبر کو نمبر ۱ دریا گنج یعنی انجمن کا مکان دیکھنے گیا۔

جا کے دیکھا تو مکان کا نقشہ ہی کچھ دوسرا نظر آیا کہ بھارت انشیورنس کمپنی لاہور نے قبضہ کر رکھا ہے - اُن کے کارکن اور ملازم کمروں میں کھچا کھچ بھرے ہوے ہیں - وہاں بھی سمای نہ ہوی تو برآمدوں کو گھیر کر یا دیواریں چن کر کمرے بنالیے ہیں - اس سے بھی پوری نہ پڑی تو صحن میں ، سیڑھیوں پر ، لان پر ، سڑکوں پر پھیلے پڑے ہیں - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ نئے قسم کے پکھیرو خاص موسم میں نقل مکان کر کے یہاں آ پہنچے ہیں -

میرا جی دھکڑ پکڑ کر رہا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ میری اُن کتابوں کا کیا حشر ہوا - جو میرے کمرے میں تھیں - جس کمرے میں کام کرتا تھا وہ بہت بڑا اور وسیع تھا - کوٹھی بھر میں اس سے بڑا کوی ہال نہ تھا - اس میں کتابوں کی متعدد الماریاں تھیں - کھلی الماریوں کے سوا دو بڑی فولادی الماریاں جن میں خاص‌خاص نادر قلمی نسخے اور قدیم فرامین اور کاغذات اور بعض نامور اشخاص مثلاً ناسخ، غالب، سر سید ، حالی ، محسن الملک، اقبال سر تیج بہادر وغیرہ کے خطوط اور اسی قسم کی بہت سی عزیز اور بیش قیمت اشیا تھیں - ان کے علاوہ کئی بڑے بڑے صندوق تھے جن میں میرے نوٹ اور یادداشتیں مختلف قسم کی اور خاص کر اردو لغات کے متعلق بہت سامان ، الفاظ کی اصل کا تحقیقی سرمایہ ، اردو زبان کی تاریخ کی یادداشتیں اور مضمون ، اور اردو ہندی تنازع کے متعلق بہت سے قدیم کاغذات (میرا ارادہ اس تنازع کی تاریخ لکھنے کا تھا) اور بہت بڑا حصہ اردو لغات کے صاف کیے ہوے مسودوں کا تھا - اس سے ملا ہوا ایک کمرہ تھا جس میں میرے کپڑوں کی الماری اور صندوق تھے - کپڑے اور دوسری چیزیں جو اس کمرے میں تھیں وہ تو لٹیروں نے سب لوٹ لیں - جو صندوق بڑے نئے اور اچھے تھے وہ بھی لے گئے باقی وہیں چھوڑ گئے - بڑے کمرے میں کاغذات کے جو صندوق تھے وہ انھیں بہت پسند آئے - کاغذات تو اُنھوں نے وہیں پھینک دئے اور صندوق لے کر چلتے بنے - فولادی مقفل الماریوں پر اُن کی للچای ہوی نظریں پڑیں اور سمجھے کہ ان میں ضرور مال و زر ہوگا - پتھر مار مار کر انھیں توڑا - جب ان میں کتابوں اور کاغذوں کے سوا کچھ نہ ملا تو بڑی مایوسی ہوی اور غصے کی جھانجھ میں وہ سب

کتابیں اور کاغذ نکال نکال کر باہر پھینک دیے ۔ کتاب خانے کے کمروں میں زیادہ گنجایش نہ رہی تھی ۔ اس لیے دو فولادی مقفل الماریاں کھانے کے کمرے میں رکھوادی تھیں ۔ ان میں اردو لغات کے پرچوں (کارڈوں) کے بنڈل بھرے ہوے تھے ۔ انھیں پرچوں پر سے کاتب نقل کر کے لغات کا مسودہ تیار کرتا تھا جو نظرثانی اور ترمیم و اصلاح کے بعد مبیّضے کے لیے کاتب کو دے دیا جاتا تھا ۔ میرے کھانے پینے کا سامان اور ظروف وغیرہ تو لوٹ ھی لیے گئے تھے لیکن ان مقفل فولادی الماریوں کو دیکھ کر قیاس کیا کہ ان میں ضرور قیمتی اشیا ھوں گی ۔ انھیں توڑا تو یہاں بھی وھی ناکارہ کاغذ نکلے جو انھیں دوسرے کمروں میں ملے تھے ۔ ان میں کچھ قلمی بیاضیں بھی تھیں ۔ ان کا بھی وھی حشر ھوا ۔ اٹھا اٹھا کر فرش پر اس طرح بکھرے پڑے تھے جیسے پت جھڑ کے موسم میں درختوں کے پتے ۔

بھارت کمپنی کو کمروں کی ضرورت تھی اور مالک مکان کو کرایہ کا لالچ ۔ لہذا کمرے خالی کرنے کے لیے انھوں نے یہ سب چیزیں جو میرے کتاب خانے کی جان تھیں بڑی بےدردی سے صحن میں کوڑے کرکٹ کی طرح پھینک دیں ۔ جہاں وہ کئی روز تک پڑی رھیں ۔ بہت سے کاغذ ھوا میں اڑ گئے اور کچھ آنے جانے والوں کی روندن میں آگئے ۔ اور جو کتاب یا کوی چیز کسی کو پسند آی وہ مال غنیمت سمجھ کر لے لی ۔ ان میں بعض نہایت خوش‌خط قدیم قرآن شریف تھے وہ پھاڑ ڈالے ۔ قدیم اردو کتابیں خط نسخ میں لکھی ھوتی ھیں انھیں بھی وہ قرآن سمجھے اور پھاڑ ڈالا ۔ نیچے کے کمرے رسالوں اور اخباروں سے بھرے پڑے تھے ۔ مالک مکان نے اپنی مہربانی سے وہ سب اخبار اور رسالے اور بہت سی ردی اور صحن میں باقی ماندہ پڑی ھوی کتابیں اور کاغذات ڈھوکر باورچی خانے ، غسل خانوں گدام ، برآمدوں اور کتاب خانے کے بغلی کمرے میں پھنکوادیے ۔ ردی کے یہ بڑے بڑے انبار جگہ جگہ پڑے تھے ۔ کتاب خانے کو کھول کے دیکھا تو معلوم ھوا کہ یہاں بھی لٹیروں کے قدم آے تھے ۔ الماریوں کی کتابیں درھم برھم کردی تھیں اور کچھ نیچے پڑی تھیں ۔ اور جو الماریاں مقفل تھیں ان کے تالے بھی توڑ کر معائنہ کیا اور کتابیں الٹ پلٹ کردیں اور جو پسند آئیں وہ نکال کر لے گئے ۔ اب ھم نے ردیوں کے ڈھیروں کا ایک ایک کاغذ دیکھنا شروع کیا ۔ کسی کتاب کا کوی کاغذ

ایک جگہ اور کوی کہیں دوسری جگہ ملا - اس تلاش اور چھٹای میں کئی مہینے لگ گئے - اس کام میں چودھری رحم علی الہاشمی، رفیق الدین احمد، محمد یعقوب میں اور بعد میں حامد علی صاحب برابر مصروف رہے - بعض نسخوں کے کاغذات جو مختلف ردیوں میں ملے جوڑ جوڑ کر الگ کیے جو پھر بھی ناقص رہے بعض کے بعض حصے پھٹے ہوے ملے - صرف چند درست حالت میں تھے مگر اکثر تلف ہوگئے - یہ کام ہمارے لیے بہت اجیرن ہوگیا تھا - شام کو جب ہم اس سے فارغ ہوتے تہ ہماری صورتیں دیکھنے کے قابل ہوتی تھیں - بعض تو بالکل بھوت نظر آتے تھے - چودھری رحم علی الہاشمی نے بیزار ہو کر مجھے لکھا کہ آپ ہم سے قلیوں کا کام لیتے ہیں - اس وقت مجھے بچپن کا یہ قول یاد آیا جو میں نے بزرگوں کی زبانی اکثر سنا تھا - کہتے ہیں کہ اللہ میاں نے فرمایا کہ اگر میں دنیا میں رہتا تو کشمیر میں رہتا - کھاتا دودھ چاول - اور کام کیا کرتا؟ کاغذ چننا - چناں‌چہ اکثر بڑے بوڑھے جب کسی کاغذ کو زمین پر پڑا دیکھتے تو اٹھاکر طاق میں یا کسی محفوظ جگہ رکھ دیتے - چودھری صاحب نے ایسے مقدس کام کو قلیوں کا کام سمجھا جسے اللہ میاں نے خود اپنے لیے پسند فرمایا تھا - چودھری صاحب کو کیا معلوم کہ ان ردی کاغذوں کے پرزوں میں ہمارے جگر کے ٹکڑے ملے ہوے ہیں - غرض ہماری کتابوں اور کاغذوں کی یہ درگت بنی - اس سے جو رنج اور کوفت ہوی اسے کیوں کر بیان کیا جاے - الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہیں - ایسے مقام پر ان چیزوں کا کیا رنج کیا جاے جہاں ہزاروں لاکھوں عزیز جانیں ایسے ظلم و جبر کا شکار ہوگئی ہوں جو دید ہیں نہ شنید، جہاں بے حرمتی اور بےعزتی کی انتہا ہوگئی ہو، جہاں معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہوں، جہاں خون پانی کی طرح بہایا گیا ہو -

میں اور علی شبر تو مولانا کے ہاں پہلے ہی سے مہمان تھے دو روز کے بعد رفیق الدین احمد بھی آگئے - اب ہم تین ہوگئے - میں نے وہاں زیادہ قیام مناسب نہ سمجھا - ایک ہفتے کے بعد ہم نظام پیلس کے گیسٹ ہاؤس (مہمان‌خانہ) میں اٹھ گئے - وہاں گئے ہمیں چار روز ہوے تھے کہ معلوم ہوا حیدرآبادی وفد آرہا ہے اور اس کے ساتھ بڑی جماعت ہوگی - ہمارے لیے کوی جگہ نہ رہے گی

ہم نے ہر چند کوشش کی کہ کوی مکان مل جاے یا کوی اور صورت ٹھیرنے کی نکل آے مگر کامیابی نہ ہوی لہذا مجبوراً کراچی روانہ ہوگئے۔ جہاں ہم نے اپنے قدیم کرم فرما اور شفیق آنریبل پیر الٰہی بخش کے ہاں قیام کیا۔ پیر صاحب نہایت نیک دل، مخلص اور مہمان نواز ہیں۔ ان کا گھر مستقل مہمان خانہ ہے۔

دلی کے اس پندرہ روزہ قیام میں ہم شہر کو زیادہ نہ دیکھ سکے۔ ہماری قسمت میں تو ردیوں کی چھانٹن لکھی تھی۔ گو بظاہر امن تھا مگر لوگ غیر مطمئن تھے۔ ہر شخص یہی کہتا تھا نہیں معلوم کل کیا ہوتا ہے خاص کر مسلمان بہت شکستہ دل اور افسردہ تھے انجمن کا مکان دارالسلام یعنی ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی دریا گنج میں تھی جو پورا ہندووں کا محلہ ہے۔ مسلمانوں کے دو ایک ہی مکان تھے اور اب تو وہ بھی نہیں رہے تھے۔ ہمارے تعلقات محلے والوں سے بہت اچھے تھے ان کے تیوہار اور شادی بیاہ کے جلسے انجمن ہی کے مکان میں ہوتے تھے۔ اب کے جو ہم آے تو مالک مکان کے سوا کوی ہم سے ملا تک نہیں۔ ہم صبح مولانا آزاد یا نظام پیاس سے انجمن میں آتے اور شام کو واپس جاتے۔ پہلے روز جب ہم تانگے میں واپس جارہے تھے تو ہندو لڑکے ہاتھ اٹھا اٹھاکر ہماری طرف اشارے کررہے تھے اور کچھ کہتے بھی جاتے تھے جو ہم نہ سن سکے۔ شاید ان کو حیرت تھی کہ ہم ابھی تک زندہ و سلامت ہیں اور اس بےباکی سے اس محلے میں آتے جاتے ہیں۔ میری یہ پرانی عادت ہے کہ سورج نکلنے سے پہلے ٹہلنے کو نکل جاتا ہوں۔ اس زمانے میں کسی مسلمان کا ایسے وقت میں باہر جانا خطرے سے خالی نہ تھا اس لیے سید علی شبر مجھے کہیں تنہا نہ جانے دیتے تھے۔ جب میں ٹہلنے کے لیے جاتا تو یہ جوٹ میرے ساتھ ہو لیتے اور جہاں کہیں بھی جاتا یہ سایے کی طرح میرے ساتھ رہتے یہ شخص خلوص و مہر و محبت اور ایثار کا پتلا ہے اس زمانے میں اور اس سے پہلے بھی اس نے انجمن کے لیے بہت سے سفر کیے لیکن تمام مصارف اپنی ذات سے ادا کیے۔ ہرچند میں نے کہا کہ جب تم انجمن کے کام کے لیے سفر کرتے ہو تو اس کا خرچ انجمن سے لے لینا چاہیے مگر اس نے ہرگز قبول نہ کیا۔ بلکہ انجمن کے لیے بہت سا روپیہ جمع کر کے لاکر دیا۔ اس نے میری اور انجمن کی جو خدمت کی ہے اسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

انجمن کی شاخیں سارے ملک میں تھیں ۔ تقسیم کے بعد پاکستان کی شاخوں کا الحاق ہندستان کے مرکز سے قایم نہیں رہ سکتا تھا ۔ اس لیے ضرور ہوا کہ پاکستان کے لیے نیا مرکز قایم کیا جاے ۔ اس معاملے میں بڑی بحث رہی کہ یہ مرکز لاہور میں ہو یا کراچی میں ۔ آخر یہ طے پایا کہ کراچی ہی میں رکھا جاے جو مرکزی حکومت کا بھی دارالحکومت ہے اور اس سے امداد ملنے کی بھی توقع ہے ۔ اور سندھ کی حکومت بھی ضرور کچھ نہ کچھ مدد دے گی ۔ لاہور میں تو کام کرنے والے بہت ہیں ۔ زیادہ ضرورت سندھ بلوچستان اور سرحد میں کام کرنے کی ہے ۔ اب ہمیں ایسے مکان کی تلاش ہوئی جو انجمن کی ضروریات کے لیے مناسب ہو ۔ اس کام کو علی شبر نے اپنے ذمے لیا ۔ وہ دن بھر اس دھن میں سارے شہر کا چکر لگاتے رہتے تھے ۔ اس کام میں ہمیں سب سے بڑی مدد اپنے ہمدرد اور مخلص دوست پیر سید حسام الدین راشدی صاحب سے ملی ۔ مہینے بھر کی تگ و دو کے بعد کئی مکانوں پر نظر پڑی ۔ اب سید علی شبر ، سید حسام الدین اور میں نے جاکر یہ سب دیکھے اور ان میں سے ایک عالی شان سہ منزلہ عمارت کا انتخاب کیا ۔ یہ گجراتی ایجوکیشن سوسائٹی کی عمارت تھی جس میں پہلے لڑکیوں کا ہائی اسکول تھا ۔ اس میں تقریباً پینتیس بڑے بڑے کمرے تھے ۔ صحن بھی تھا اور صحن سے ملحق بھی چند کمرے تھے ۔ چناں چہ اس کے لیے ہم نے ایک درخواست آنریبل پیر الہی بخش صاحب وزیر تعلیم کی خدمت میں پیش کی ۔ پیر صاحب نے ہماری درخواست پر سید ہاشم رضا صاحب کلکٹر کراچی کے نام سفارش فرمادی

سید ہاشم رضا صاحب بہت منتظم اور قابل شخص ہیں اور اردو زبان و ادب سے خاص ذوق رکھتے ہیں ۔ سید علی شبر نے یہ درخواست آن کی خدمت میں پیش کی ۔ انہوں نے اپنی مہربانی سے اس کی منظوری دیدی ۔ اس ساری عمارت میں مہاجر بھرے ہوے تھے آن سے مکان خالی کرانا ہمارے بس کی بات نہ تھی ۔ ہم تو کیا حکومت بھی اس معاملہ میں عاجز تھی ۔ جب اس کا ذکر ہم نے حکیم محمد احسن صاحب سے کیا جو اس وقت کراچی کارپوریشن کے میئر تھے تو انہوں نے فرمایا کہ میں آپ کو اس سے بہتر مکان کی نشاندہی کرتا ہوں جو باغوں کا نمونہ ہے آپ کل میرے ساتھ چل کر دیکھئے ۔ دوسرے دن ہم آن کے ساتھ گئے اور وہ

ہمیں شاردا مندر میں لے گئے - آسے تفصیل سے دیکھنے کے بعد ہم حکیم صاحب کے انتخاب کے قائل ہو گئے - اس کے لیے ہم حکیم صاحب کے شکر گذار ہیں - چناں‌چہ اب ہم نے دوسری درخواست پیش کی کہ پہلی عمارت کی منظوری خارج کر کے شاردا مندر کی منظوری عنایت فرمای جاے - اس غرض کے لئے ۲۰ دسمبر کو حکیم محمد احسن صاحب، پیر سید علی محمد راشدی صاحب ، پیر سید حسام الدین راشدی صاحب ، سید علی شبر حاتمی اور میں کلکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوے اور آن سے درخواست کی کہ گجراتی ایجوکیشن سوسائٹی کی عمارت کی بجاے شاردا مندر کی عمارت انجمن کے لیے نامزد فرمای جاے- وجوہ سننے کے بعد انہوں نے اپنی عنایت سے اس کی منظوری لکھ دی - شاردامندر گجراتیوں کا سب سے بڑا ادارہ تھا اور اس میں تخمیناً ۱۲ سو طالب علم تعلیم پاتے تھے - انجمن کے لئے اس سے بہتر عمارت کراچی شہر میں نہیں مل سکتی تھی - ہم سید ہاشم رضا صاحب کے تہ دل سے شکر گزار ہیں - لیکن اس میں بھی وہی مشکل تھی یعنے یہاں بھی مہاجر آباد تھے - یہ سید علی شبر ہی کا کام تھا کہ انہوں ایک مہینے کے اندر بڑی خوبی اور سلیقے سے خالی کرا لیا - میں اس سے پہلے ہی وہاں سے چلا آیا تھا - سید علی شبر صاحب اس کام مین مصروف رہے-

میں دلی جانے کے لئے تڑپ رہا تھا - میرے سب دوست احباب سمجھاتے تھے کہ اب اس ملک میں اردو کے کام کے لیے کوئی گنجائش نہیں- حکومت مخالف ، اکثریت مخالف ، کوی کیا کام کرسکتا ھے- خصوصاً تمہارا وہاں جا کر کام کرنا خطرے سے خالی نہیں - اور تو اور ہمارے مخدوم علامہ کیفی صاحب بھی دلی میں رہ کر کام کرنے کے مخالف تھے - وہ بھی یہی کہتے تھے کہ ہندستان میں تو آردو کا خاتمہ ہو گیا اب یہ پنپے گی تو پاکستان ہی میں پنپے گی - سب سے قوی دلیل یہ تھی کہ آزادی ملتے ہی یوپی کی حکومت نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے صوبے کے دفتروں عدالتوں اور مدارس سے آردو کو یک قلم خارج کیا - حالانکہ یوپی وہ صوبہ ھے جہاں آردو نے وہ ترقی اور عروج حاصل کیا جو ہندستان کی دوسری زبانوں کے لیے قابل رشک ھے - اور جو اپنی شیرینی ، فصاحت ، وسعت اور قوت کے اعتبار سے ہندستان کی زبانوں میں خاص امتیاز رکھتی ھے اور جس کے لکھنے پڑھنے ، بولنے اور سمجھنے والے ہر قوم و ملت کے لوگ ہیں - اور یہی

ایک ایسی زبان ہے جو بر عظیم پاک ہند میں ہر جگہ بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ یوپی کی حکومت نے اس کار خیر میں انتہائی عجلت سے کام لیا گویا اگر اردو کو ملک سے خارج نہ کیا گیا تو دنیا کے امن و آسائش میں بڑا خلل واقع ہو جائے گا۔ اور عجیب لطیفہ یہ ہے کہ اس کی بجائے جو زبان رائج کی جا رہی ہے وہ آکاش بانی (یعنے آسمانی زبان) ہو تو ہو لیکن بیچارے زمین والے تو اس کے سمجھنے اور بولنے سے قاصر ہیں۔ یہ راز پہلی بار معلوم ہوا کہ قانون کی طرح حکومت زبان بھی بناتی ہے اور زبردستی رائج کرتی ہے۔ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں اور دلیلیں پیش کرتے تھے۔ میں ان سے بحث نہیں کرتا تھا۔ میرا ایک ہی جواب تھا کہ ہندستان میں ہمارے لاکھوں کروڑوں بھائی اس زبان کے بولنے والے ہیں ان کی خدمت کرنا بھی تو ہمارا فرض ہے۔''

آخر میں نے ۷ جنوری ۱۹۴۸ء کو پھر ایک بار دلی جانے کا قصد کیا۔ لیکن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ۶ جنوری کو محمودہ رضویہ نے جو اردو زبان کی بڑی دلدادہ اور مشہور مصنفہ ہیں میری دعوت کی۔ جس میں آنریبل پیر الٰہی بخش صاحب پیر سید حسام الدین راشدی صاحب، سید علی شبر حاتمی، حامد علی صاحب بھی شریک تھے۔ کھانے کے بعد محمودہ نے انجمن کو دوسو روپیہ عنایت کیے۔ یہ پہلے بھی کئی بار انجمن کو عطیے دے چکی ہیں۔ قریب دو بجے کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد واپس ہو رہے تھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سکھوں کے گردوارے کے پاس لوگوں کا ہجوم دکھائی دیا اور آس پاس دو تین لاشیں بھی سڑک پر پڑی ملیں۔ معلوم ہوا کہ فساد ہو گیا ہے۔ دیکھتے ہی موٹر کار سے اتر پڑے۔ پیر الٰہی بخش صاحب کی حالت قابل دید تھی۔ وہ لکڑی لیے دیوانہ وار ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ لوٹنے والوں سے مار مار کے سامان واپس لیا۔ ہندو بیچارے جو بہت سراسیمہ اور پریشان تھے ان کو تسلی دی اور بچوں اور عورتوں کو حفاظت کی جگہ پنہچایا۔ ان کی اس مستعدی اور بے تابانہ کارگزاری کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ ان سب کوچوں گلیوں میں پہنچے جہاں فساد ہوگیا تھا اور اس کے فرو کرنے میں اس قدر سعی اور تگ ودو کی کہ بڑے عہدہ دار اور وزیر تو درکنار ایک پولس والا بھی اس دل سوزی اور ہمدردی سے اپنا فرض ادا نہیں کرتا۔ اتنے میں

پولس بھی آگئی لوٹنے والوں کو گرفتار کیا اور بعض کو گولی ماردی - چند ھی گھنٹوں میں فساد فرو ھوگیا - پیر صاحب شام تک اس میں مصروف رہے اور واپسی میں اپنے ساتھ بہت سے ھندو مردوں عورتوں اور بچوں کو لیتے آے اور اپنے مکان میں پناہ دی - وہ لوگ بڑے اطمینان سے وھاں کھاتے پکاتے اور نہاتے دھوتے رہے - ایک شب علی شبر نے ان میں سے ایک صاحب سے باتیں کیں اور اُن کے حالات دریافت کیے تو اس نے کہا کہ ۱۵ اگست سے پہلے ھی کانگرس والوں نے ھندوؤں میں یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا تھا کہ لیگ والوں کا یہ منصوبہ ہے کہ ۱۵ اگست کے بعد تمام ھندوؤں کا مال اسباب لوٹ لیا جائے اور ان کو قتل کر دیا جاے - اس پروپیگنڈے سے سندھ کے تمام ھندو ھراساں اور پریشان ھو گئے اور انھوں نے گھر بار چھوڑ کر بھاگنا شروع کیا - ھم بھی خوف کے مارے بمبئی چلے گئے - وھاں ھندوؤں نے ھمارے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا اور ھمیں طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائیں جب ھم کوئی چھوٹا موٹا کاربار شروع کرتے تو مدد دینا تو ایک طرف وہ ھمارے کام میں روڑے اٹکاتے تھے - ھم یہاں مسلمانوں سے بہت خوش تھے اور بڑے امن و صلح کے ساتھ رہتے تھے - ھمارا ان کا کھانا پینا ، رھنا سہنا ، آداب و اطوار یکساں تھے - بمبئی کے ھندوؤں کی ھر بات ھم سے مختلف تھی - یہاں تک کہ ان کا کھانا پینا بھی ھم سے الگ تھا اور ھمیں پسند نہ تھا - کانگرس والوں نے ھمیں خواہ مخواہ اس مصیبت میں پھنسا دیا - جب اذیت اور تکلیف حد سے زیادہ بڑھ گئی تو ھم ناچار پھر واپس آ گئے - اور اطمینان سے اپنا کار و بار کر رہے تھے کہ اب سکھوں کے آجانے سے یہ فساد برپا ھوگیا -

دریافت کرنے سے یہ معلوم ھو کہ سکھوں کی ایک جماعت سندھ کے بعض اضلاع سے ھندستان جا رھی تھی - جب یہ لوگ کراچی کے اسٹیشن پر پہنچے تو معلوم ھوا کہ جو جہاز انھیں بمبئی لے جانے والا ہے اس کے جانے میں ابھی بہت دیر ہے - وہ اپنے گردوارے کی زیارت کے لیے شہر میں گئے - جب مشرقی پنجاب کے مظلوم اور ستم رسیدہ مہاجرین نے جن پر سکھوں نے طرح طرح کے ظلم و ستم کیے تھے اور جن کے ھاتھوں اُن کے عزیز اقارب ، بیوی بچے نہایت بیدردی سے ھلاک ھوے تھے ، اُن کو گردوارے میں جاتے دیکھا تو انھیں اشتعال پیدا ھوا اور آپے سے باھر ھوگئے - متعدد سکھ مارے گئے اور ان کی لپیٹ میں چند ھندو بھی آ گئے - اگر یہ سکھ اپنے ارادے سے حکومت کو اطلاع

کردیتے تو پولیس ان کو اپنی حفاظت میں گردوارے لے جاتی اور یہ افسوسناک حادثہ وقوع میں نہ آتا۔

اس فساد میں چند باتیں خاص طور پر قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی عورت کی بےحرمتی نہیں کی گئی اور نہ کسی عورت اور بچے پر ہاتھ اٹھایا۔ دوسرے تین چار گھنٹے میں فساد فرو ہوگیا۔ تیسرے شہر کا کوی مسلمان اس میں شریک نہ ہوا۔ جو کچھ کیا مہاجرین نے کیا۔ انھوں نے بھی ہندووں کو ہلاک نہیں کیا۔ چوں‌کہ بےسرو سامان تھے، سامان لوٹنے میں لگ گئے۔ کوی بستر اٹھائے دوڑا جارہا تھا، کسی کے ہاتھ میں برتن تھے۔ غرض جو جس کے ہاتھ لگا لے بھاگا۔ ایک قابل تعریف بات یہ ہوی کہ جب دوسرے روز" پاکستان کے نامور وزیر فنانس مہاجرین کے کیمپ دیکھنے گئے تو انھوں نے ہر کیمپ کے مہاجرین کو ایک جگہ جمع کیا۔ اور ان سے کہا تم مسلمان ہو کلمہ پڑھو۔ سب نے باآواز کلمہ پڑھا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ خدا کو حاضر ناظر جان کر کہو کہ تم نے کیا کیا لوٹا ہے اور جو کچھ لوٹا ہے وہ سب یہاں لا کے رکھ دو۔ اس کا مہاجرین پر بہت اثر ہوا اور انھوں نے" ایک ایک چیز لاکر رکھ دی۔ لوٹے ہوے مال کا ڈھیر لگ گیا۔ تب ہندووں کو بلاکر کہا کہ جو جو جس کی چیز ہے وہ اس میں سے لے لے۔ بعض جگہ تو یہ بھی ہوا کہ کسی ہندو نے مہاجر کی کسی چیز کو کہا کہ یہ میری ہے تو وہ بھی اسے دے دی گئی۔ مہاجر کی یہ مجال نہ ہوی کہ کہتا اس کی نہیں میری ہے۔ اس فساد کا اگر ہندستان کے فسادوں سے مقابلہ کیا جائے تو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

دوسرے دن یعنی ۷ جنوری کو ۸ بجے رات سے ۸ بجے صبح تک کرفیو لگ گیا۔ بیچ میں دو گھنٹے کے لیے ۲ سے ۴ بجے تک کے لیے اٹھا دیا گیا۔ میں اس وقفے میں بازار کی سیر کو نکلا تو دیکھا ہندو مسلمان سب اطمینان سے کھلے پھر رہے ہیں اور یہ خیال میں بھی نہیں آتا کہ یہاں کوی فساد ہوا ہے۔ ۸ جنوری کو بھی ایسا ہی کرفیو رہا۔ تیسرے دن بھی کرفیو تھا لیکن ۱۲ بجے دن سے ۴ بجے تک اٹھا دیا گیا۔ دو دن اور بیچ میں چند گھنٹوں کے وقفے سے کرفیو جاری رہا۔

۱۲ جنوریٔ کو کرفیو صرف شام کے ٦ بجے سے صبح کے ۹ بجے تک رہا ۔

اس فساد کی وجہ سے میرا دلی جانا رک گیا ۔ آخر ۱۳ جنوری کو علی‌شبر نے مجھے اور حامد علی صاحب کو زاهد حسین صاحب کے همراه هوای‌جہاز میں سوار کردیا ۔ میں زاهد حسین صاحب کے هاں مہمان رہا ۔

زاهد حسین صاحب بڑے فرض شناس ، سنجیده مزاج اور اپنے کام کے ماهر هیں ۔ آنهوں نے میری بڑی خاطر مدارات کی ۔ جس کے لیے میں ان کا بہت ممنون هوں ۔ حامد علی اور رفیق الدین احمد کو آنهوں نے اپنی عنایت سے شیرشاه میس میں جہاں های کمشنر کا دفتر هے قیام کی اجازت عنایت فرمای ۔ انجمن کے مکان میں گیا ۔ وهاں ردیوں کی چھٹای کا کام جاری تها جس کا ذکر پہلے کرچکا هوں ۔ ان ردیوں کی چھٹای اور کتب خانے کے معائنے کے بعد بہت سی کتابوں اور مسودوں کے تلف هونے کا ٹهیک ٹهیک علم هوا ۔ جب کوی عزیز کتاب یا مسوده نہیں ملتا تها تو اس کے ضایع هونے پر دل کو چوٹ سی لگتی تهی ۔

دلی پہنچنے کے بعد میں دوسرے روز گاندهی جی سے ملنا چاهتا تها لیکن اسی روز آنهوں نے فاقه شروع کردیا ۔ پانچ روز بعد آنهوں نے فاقه توڑ دیا ۔ لیکن فوراً ملنا مناسب خیال نه کیا کیوں‌که آن پر نقاهت کا اثر تها ۔ اس لیے میں رفیق صاحب کے ساتھ علی گڑھ چلا گیا ۔ اور سفر سے واپسی پر ملاقات کو منحصر رکها ۔ ۲۴ جنوری کو مسلم یونی‌ورسٹی علی گڑھ کی کان وو کے شن میں شریک هوا ۔ پنڈت جواهر لال نہرو نے خطبه پڑها ۔ لکهے هوے خطبے سے پہلے آنهوں نے چند کلمات زبانی ارشاد فرماے ۔ جس میں آنهوں نے کہا که مسلم یونی‌ورسٹی کے نام سے مسلم کا لفظ خارج کر دیا جاے ۔ دوسری بات آنهوں نے یه کہی که میں نے اس کان وو کے شن میں انگریزی اور عربی کا استعمال دیکها لیکن اپنی زبان کسی نے بهی استعمال نه کی ۔

۲۵ جنوری ۴۸ع کو ٦ بجے شام کے میری درخواست پر اولڈ بوائز لاج میں همدردان آردو کا اجتماع هوا ۔ اس میں تقریباً پچیس حضرات تشریف لاے ۔ ان میں نواب اسمعیل خاں صاحب وائس‌چانسلر بیگم اعزاز رسول ، شیخ عبدالله ، پروفیسر محمد شریف ، پروفیسر منظور حسین ، آل احمد سرور صاحب ، پروفیسر رشید احمد صدیقی

سید الطاف علی صاحب ، محمد بشیر الدین صاحب لائبریرین ، ڈاکٹر ابواللیث ، امیرالدین قدوائی صاحب وغیرہ شریک تھے اس کا مقصد ان دو امور پر غور کرنا تھا ۔ اول: یہ کہ انجمن ترقی اردو کا صدر مقام اب کہاں رکھا جاے ۔ دوسرے موجودہ حالات میں اس کا پروگرام کیا ہو ۔ میں نے اپنی مختصر تقریر میں ان صاحبوں کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ بعض اصحاب کی جنھیں اردو اور انجمن سے خاص ہمدردی ہے ۔ یہ راے ہے کہ انجمن کا صدر مقام دلی سے علی گڑھ میں منتقل کر دیا جاے ۔ کیوں کہ یونیورسٹی کے اہل علم اور طلبہ سے اس کام میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے ۔ علی گڑھ سر سید کے زمانے سے اردو کا مرکز رہا ہے اور اس وقت بھی یہی مقام اردو کی مرکزیت کے لیے زیادہ موزوں اور مناسب ہوگا ۔ لیکن میں نے صاف صاف یہ بھی کہہ دیا کہ اگر انجمن کے یہاں لانے سے یونیورسٹی پر حرف آنے یا اسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو مجھے ہرگز یہ منظور نہیں کہ علی گڑھ کو انجمن کا صدر مقام بنایا جاے ۔ اس پر کچھ دیر تک گفتگو رہی ۔ بعض صاحبوں کی راے تھی کہ تبلیغ و اشاعت کا کام بالکل ترک کردیا جائے ۔ بیگم اعزاز رسول اور پروفیسر محمد شریف نے فرمایا کہ انجمن کا نام بدل دیا جائے ۔ اس سے ان کی غرض یہ تھی کہ اردو کا نام خارج کردیا جاے ۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ راے دینے سے پہلے وہ اپنے نام بدل دیتے تو اس کہنے کا کچھ اثر بھی ہوتا ۔ غرض اس مشورے سے کوی نتیجہ برآمد نہ ہوا ۔ صرف سید الطاف علی صاحب اور امیرالدین قدوای صاحب کا یہ اصرار تھا کہ علی گڑھ میں آکر کام کیا جاے ۔ اس اجتماع میں جو صاحب شریک تھے ان کی گفتگو سے مجھ پر یہ اثر ہوا کہ یہ لوگ موجودہ حالات کی وجہ سے کچھ سہمے ہوے سے ہیں اور کوی قطعی راے قایم نہیں کر سکتے یا صاف صاف کچھ کہنا نہیں چاہتے ۔

۲۸ جنوری کو میں الہ آباد روانہ ہوگیا ۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کے ہاں قیام تھا ۔ دوسرے دن سر تیج بہادر سپرو کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ ان کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ ہاتھ پانو کام نہیں دیتے ۔ آواز بھی بہت دھیمی ہوگئی ہے ۔ ملازم سگرٹ سلگا کر ان کی انگلیوں میں رکھ دیتا تھا ۔ راکھ تک نہیں جھاڑ سکتے تھے ۔ ملازم لے کر جھاڑتا ۔ کہنے لگے میں نے انجمن کی

صدارت سے استعفا لکھ بھیجا تھا، میں اب کام کے قابل نہیں رہا۔ میں نے کہا مجھے کوی ایسا خط نہیں ملا۔ آپ جب تک زندہ ہیں (خدا آپ کو صحت کے ساتھ زندہ و سلامت رکھے) انجمن کی صدارت آپ ہی کے نام رہے گی۔
۳۰ جنوری کو مغرب کے وقت اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ میاں زبیر (فرزند ڈاکٹر صدیقی) گھبراے ہوے آئے اور کہنے لگے کہ کسی نے گاندھی جی کو گولی مارکر ہلاک کردیا۔

میں نے کہا کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔ اس نے کہا کہ میں امرت بازار پترکا کے دفتر سے آ رہا ہوں۔ ابھی ابھی خبر آئی ہے۔ یہ سن کر میں بھی بہت پریشان ہوا۔ یہ خبر ریڈیو سے سنائی گئی تھی۔ اس میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ مارنے والا کون ہے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ مارنے والا ضرور کوئی مسلمان ہوگا۔ چنانچہ بعد کی خبروں سے معلوم ہوا کہ اس خبر کے سنتے ہی بمبئی اور بعض دوسرے مقامات پر مسلمانوں پر حملے کیے گئے اور متعدد مسلمان ہلاک اور زخمی ہوئے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد یہ اطلاع آئی کہ قاتل ایک ہندو نوجوان تھا۔ یہ مرہٹہ تھا اور سنگھی جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی جان میں جان آئی۔ میں دوسرے دن دلی جانے والا تھا اور ارادہ تھا کہ یکم فروری کو گاندھی جی سے ملاقات کروں گا۔ افسوس دل کی یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔

۳۱ جنوری کی روانگی ملتوی کی اور ۲ فروری کو اٹاوہ روانہ ہوا۔ مولوی بشیرالدین صاحب سے مفصل گفتگو کرنا چاہتا تھا کہ ہندستان میں اب جو حالات پیدا ہوگئے ہیں اور یہاں کی حکومتوں نے اردو کے نیست و نابود کرنے پر کمر باندھ رکھی ہے تو اس کے پیش نظر اردو کو قائم رکھنے اور اس کی اشاعت کے لیے کیا صورت اختیار کی جائے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ اسی روز صبح کی گاڑی سے علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں ڈاکٹر ضیاءالدین مرحوم کی نعش آنے والی تھی اور وہ ڈاکٹر صاحب کی تجہیز و تکفین میں شریک ہونے کے لیے گئے ہیں۔ میں ناچار دوسرے روز دلی واپس آگیا۔

دلی کے اس دوران قیام میں مکان کی تلاش میں حامدعلی صاحب اور میں دلی کے کوچوں کی خاک چھانتے پھرے۔ کوئی مکان ایسا نظر نہ آیا جہاں ہم اپنا دفتر اور کتب خانہ منتقل کرسکیں، ایک دو مکان ایسے ملے بھی جہاں بری بھلی طرح

بسر ہوسکتی تھی تو وہ نہایت خستہ حالت میں تھے اور ایسی تنگ اور غلیظ گلیوں میں واقع تھے کہ وہاں بڑی بڑی الماریاں اور دوسرے سامان کا پہنچانا دشوار تھا اب بڑی مجبوری پیش آئی ۔ آنریبل محمد رفیع قدوائی نے اس بارے میں بڑا اچھا مشورہ دیا ۔ انہوں نے کہا کہ اینگلو عربک کالج کا ایک حصہ بالکل خالی پڑا ہے اور اس کالج کے پوری طرح آباد ہونے میں سال دو سال کا عرصہ لگے گا ۔آپ انجمن کو وہاں منتقل کردیجیے ۔ ڈاکٹر ذاکرحسین صاحب کالج کی کمیٹی کےصدر ہیں۔ اس کے متعلق میں نے اُن سے گفتگو کی ۔ انہوں نے مجھے اطمینان دلایا کہ اس کا انتظام ہوجائے گا ۔

۲۰ فروری ۱۹۴۸ء کو میں رام پور مولوی سید ہاشمی سے ملنے گیا ۔ فریدآباد کے مسلمانوں کو باوجود مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال کے وعدوں اور اطمینان دلانے کے اپنا عزیز وطن مجبور ہوکر ترک کرنا پڑا ۔ ہاشمی صاحب نے عارضی طور پر رام پور میں آکر پناہ لی ۔ وہ کراچی جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے میرے کہنے کی دیر تھی ۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ وہ اپنا انتظام کرکے چند روز کے بعد دلی آجائیں اور میرے ساتھ کراچی چلیں ۔ مجھے کراچی اس لیے واپس جانا پڑا کہ زاھد حسین صاحب کا دلی سے تبادلہ ہوگیا اور میرے قیام کی کوئی صورت نہ رہی زاھد حسین صاحب ۳ مارچ کو کراچی روانہ ہوگئے ۔ ہاشمی صاحب رام پور سے آگئے ۔ اب ہم بھی ۵ مارچ ۴۸ء کو ہوائی جہاز سے لاہور پہنچ گئے اور اپنے مخلص دوست مرحوم پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال کے ہاں قیام کیا ۔ پروفیسر اقبال اپنے اعلیٰ اخلاق اور علم و فضل کی بنا پر خاص لوگوں میں سے تھے مجھ سے وہ جس خلوص و محبت کا برتاؤ کرتے تھے اُسے میں کبھی نہیں بھولوں گا ۔ لاہور میں سر شیخ عبدالقادر ، میاں بشیر احمد شیخ کرامت علی وزیر تعلیم ، صلاح الدین احمد صاحب اڈیٹر ادبی دنیا ، حمید احمد خاں پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور ، عبدالقیوم ملک اور دیگر حضرات سے ملاقات ہوئی ۔ ۹ مارچ ۴۸ء کو ہم کراچی روانہ ہوگئے ۔

اسٹیشن سے ہم سیدھے شاردا مندر پہنچے ۔ جب میں کراچی سے چلا تھا تو وہاں پناہ گزیں آباد تھے ۔ اس عرصے میں شبر حاتمی صاحب نے حکمت عملی سے

مکان خالی کرا لیا تھا۔ اس وقت مکان کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ اب جو آکر دیکھا تو کچھ اور ہی نقشہ تھا۔ شبر صاحب نے ضروری مرمت اور صفائی کے بعد چمن کو آراستہ کر کے سارے مکان کو آئینہ بنادیا تھا۔

یہاں آتے ہی ہم اپنے کام میں مصروف ہوگئے اور انجمن ترقی اردو پاکستان کا ڈول ڈالنا شروع کردیا۔ ایک کام اس اثنا میں یہ کیا کہ قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کو لکھا کہ انجمن اب کراچی میں منتقل ہوگئی ہے اور اسے ایک مناسب مکان بھی مل گیا ہے۔ ہماری یہ تمنا ہے کہ اس کا افتتاح اپنے دست مبارک سے فرمائیں۔ قائد اعظم نے جواب میں بڑی مسرت کا اظہار کیا (۱۶ مارچ ۴۸ع) اور لکھا کہ آج کل بہت مصروف ہوں، سرحد کے دورے سے واپسی پر ۱۵ اپریل کے بعد کسی روز بڑی خوشی سے انجمن ترقی اردو پاکستان کا افتتاح کروں گا۔

۲۶ مارچ ۴۸ع کو (بروز جمعہ) لاہور میں پنجاب یونی ورسٹی اردو کانفرنس تھی۔ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر صاحب نے اس کی صدارت کا وعدہ مجھ سے اسی وقت لے لیا تھا جب میں دلی میں تھا۔ اس لیے میں اور سید ہاشمی صاحب ۲۳ کی صبح کو پاکستان اکسپریس سے لاہور روانہ ہوگئے۔ دوسرے دن لاہور پہنچ گئے۔ میرا قیام خان عبدالمجید خاں صاحب (علیگ) کے ہاں تھا۔ ۲۶ کو ۱۰ بجے صبح کے کانفرنس شروع ہوئی۔ اس کا افتتاح سر شیخ عبدالقادر صاحب نے فرمایا۔ سردار عبدالرب نشتر صاحب گورنر پنجاب نے ایک تقریر کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر عمرحیات ملک صاحب وائس چانسلر نے اپنا خطبۂ استقبالیہ پڑھ کر سنایا۔ یہ خطبہ ختم ہوا تو میں نے خطبۂ صدارت پڑا۔ تقسیم کے بعد یہ پہلی اردو کانفرنس تھی جو لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس لیے اسے بڑی اہمیت دی گئی۔ یہ پنجاب کے اہل فکر اور اہل علم کا بڑا اچھا اور ستھرا مجمع تھا۔ اسی سلسلے میں ایک علمی و ادبی نمائش بھی رکھی تھی جس کا انتظام یونی ورسٹی لائبریری میں کیا گیا تھا۔ کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد دو روز تک ملاقاتوں اور دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ لاہور کے بعض احباب کا اصرار تھا کہ انجمن کا صدر مقام لاہور ہونا چاہیے اس پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی جس کا اعادہ اس موقع پر نا مناسب ہوگا۔ ۲۹ مارچ کو روانہ ہوکر ۳۰ مارچ کو کراچی آ گیا۔

۳ اپریل کو احمد آباد میں اردو کانفرنس قرار پائی تھی اور ڈاکٹر ظہیرالدین اس بارے میں مجھ سے پہلے ہی سے خط و کتابت کر رہے تھے اور ان کا اصرار تھا کہ اس کی صدارت میں ہی کروں۔ چنانچہ یکم اپریل کو میں، مولوی سید ہاشمی اور سید علی شبر میل سے احمد آباد روانہ ہوئے اور ۲ کی شب کو احمد آباد پہنچے۔ قیام ڈاکٹر ظہیرالدین صحب کے ہاں ہوا۔ ۳ کی صبح کو جناب پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی صاحب بھی بمبئی سے آگئے۔ احمد آباد سے ایک صاحب خاص طور پر انہیں لانے کے لیے گئے تھے۔ شب کو کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا۔ مست بدایونی صاحب نے نظم پڑھی۔ جناب کیفی صاحب نے افتتاحی تقریر فرمائی اور ایک مضمون پڑھا۔ خطبۂ استقبالیہ کے بعد میں نے خطبۂ صدارت پڑھا۔ احمد آباد میں اردو کا عام رواج ہے اور اب بھی وہاں اردو کے انشا پرداز اور ادیب موجود ہیں۔ یہ کانفرنس بہت پررونق تھی اور وہاں کے شرفا نے بڑے شوق سے اس میں شرکت کی دوسرے روز مجلس موضوعات کا اجلاس ہوا اور سہ پہر کو قرار دادیں پیش ہوئیں۔ شب کو مشاعرہ ہوا۔

احمد آباد سے میں اور کیفی صاحب ۷ اپریل کو کراچی پہنچے۔ سید علی شبر اور سید ہاشمی ہم سے ایک روز پہلے آگئے تھے۔ ۱۴ اپریل کو آنریبل فضل الرحمن صاحب وزیر تعلیم و داخلہ نے اپنے مددگار کو بھیجا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ۱۷ کو فضل الرحمن صاحب سے ملا۔ وہ انجمن کے کانسٹی ٹیوشن کے متعلق دریافت فرماتے رہے۔ انہوں نے انجمن کے مقاصد کی تائید اور امداد کا وعدہ کیا۔

کراچی میں انجمن کا کام آہستہ آہستہ جم رہا تھا مگر میرے دل میں دلی کی لو لگی ہوئی تھی اور سوتے جاگتے وہیں کے خواب دیکھتا تھا۔ خاص کر اپنے کتب خانے کی بربادی کا خیال بہت ستاتا تھا۔ اوپر لکھ چکا ہوں کہ دلی مجھے مجبوراً چھوڑنی پڑی کیونکہ زاھد حسین صاحب کے چلے آنے کے بعد کوئی ٹھکانہ ٹھہرنے کا نہ رہا۔ اب چون کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے (جیسا کہ انہوں نے وعدہ کیا تھا) کتب خانے کو اینگلو عربک کالج دھلی کی عمارت میں جو خالی پڑی تھی منتقل کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ اور وھاں میرے قیام کا بھی انتظام ہوگیا تھا تو اب میں جانے کے لیے بےقرار تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اسی زمانے میں میری طبیعت سخت ناساز ہوگئی۔ لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب بڑی توجہ سے علاج کرتے رہے لیکن علالت کا

سلسلہ کم نہ ہوا ۔ اسہال کی وجہ سے نقاہت بہت بڑھ گئی تھی ۔ اس کے ساتھ ہی ملیریا کا بھی حملہ ہوا ۔ ڈاکٹر صاحب نے انجکشن تجویز کیے ۔ اسی زمانے میں اقبال اکیڈیمی قائم ہوئی ۔ اس کی فونڈیشن کمیٹی کے صرف تین ممبر تھے آنریبل فضل الرحمن صاحب (صدر) اور فیروزخان نون صاحب اور میں ۔ ان جیکشنوں کا سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا ۔ اس سے فائدہ بھی ہوا ۔ مگر کچھ دنوں بعد بخار نے پھر آدبوچا ۔ آخر سب کی یہ رائے قرار پائی کہ میں تبدیل آب و ہوا کے لیے کوئٹہ چلا جاؤں جہاں کی آب و ہوا صحت کے لیے بے نظیر ہے ۔ چنانچہ میں ۲۲ جولائی کو کوئٹے روانہ ہوگیا ۔ ڈائرکٹر صاحب تعلیم صوبہ' بلوچستان کے قیام گاہ میں اصل عمارت کے ساتھ بہت وسیع میدان ہے اور اس میدان میں ایک نہایت عظیم الشان چنار کا درخت ہے جس کی بلندی اور پھیلاؤ کو دیکھ کر قدرت کا تماشا نظر آتا ہے ۔ مقبول الرحیم صاحب نے ڈائرکٹر صاحب (امتیاز محمد خاں صاحب) سے کہہ کر میرے لیے اس درخت کے متصل ایک بڑا ڈیرا لگا دیا تھا ۔ میں دن بھر اس درخت کے زیر سایہ بیٹھا کام کرتا رہتا تھا ۔ اور اس شاندار درخت کی شوکت و عظمت اور گھنے سایہ کا لطف اٹھاتا رہتا ۔

۲۵ جولائی کو شام کے ساڑھے پانچ بجے گورنمنٹ کالج کے لان پر میری صدارت میں یوم اردو منایا گیا ۔ ۲۷ کو میری صدارت میں بلوچستان ٹیچرز ایسوسی ایشن کا سالانہ جلسہ ہوا ۔ ابھی مجھے کوئٹہ آئے سولہ سترہ دن ہی ہوئے تھے کہ کراچی سے یہ وحشت ناک خبریں پہنچیں کہ اگر میں جلد دلی نہ پہنچا تو حکومت انجمن کو امداد بھی نہیں دے گی (جس کی منظوری ہوچکی تھی) ، زمین بھی ضبط کرلے گی اور کتب خانے سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا ۔ یہ خبر بعض نہایت معتبر اشخاص دلی سے لائے تھے ۔ اس روز میں زیارت جانے والا تھا ، سامان گاڑی میں رکھا جاچکا تھا ، میرے بیٹھنے کی دیر تھی کہ یہ خبر پہنچی ۔ اس سے مجھے بے حد پریشانی ہوئی سفر کا ارادہ فسخ کر دیا اور دوسرے روز یعنی ۱۰ اگست کو کراچی

روانہ ہو گیا۔ دو تین روز کے بعد خان عبداللطیف خاں صاحب (مالک لطیفی پریس) دلی سے آئے انہوں نے اُن تمام باتوں کی تصدیق کی جو اب تک ہمیں پہنچی تھیں۔ ہمدرد احباب نے جو اُس وقت کے حالات سے زیادہ با خبر تھے یہ مشورہ دیا کہ پہلے جناب کیفی صاحب کو دلی بھیجا جائے اور ان کو مولانا ابوالکلام آزاد ڈاکٹر تاراچند اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے نام خط دیے جائیں وہ دلی پہنچ کر ان صاحبوں سے ملیں اور وہاں کا رنگ دیکھیں۔ اور تمام حالات معلوم کر کے لکھیں۔ اس کے بعد مجھے دلی کا قصد کرنا چاہیے۔

۱۶ اگست کو میں اور جناب کیفی صاحب سری پرکاش صاحب ہائی کمشنر بھارت متعینہ پاکستان سے ملے وہ بڑی عنایت اور اخلاق سے پیش آئے۔ انہوں نے میرا پرمٹ خود اپنے قلم سے بنایا اور اس کی پشت پر یہ بھی لکھ دیا کہ وہ انجمن کی ضرورت کے لحاظ سے اسی پرمٹ کے ذریعہ کراچی سے دلی اور دلّی سے کراچی آجا سکتے ہیں۔ کیفی صاحب اور حامد علی صاحب کے لیے بھی پرمٹ حاصل کیے۔

حامدعلی صاحب تین چار روز کے بعد دلی روانہ ہو گئے میں بھی جانے کے لیے تیار تھا لیکن دلی سے خط آئے کہ ابھی ادھر کا رخ ہرگز نہ کرنا۔ بات یہ ہے کہ ریاست حیدرآباد اور بھارت یونین کے معاملات بہت نازک حد تک پہنچ گئے تھے۔ جن اشخاص کا تعلق حیدرآباد سے تھا وہ بد گمانی کا شکار تھے اور اُن پر کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی۔ اور یہ اندیشہ تھا کہ اگر حالات زیادہ خراب ہوے تو حراست میں لے لیے جائیں گے۔ کیفی صاحب ۲۰ اگست کو لایل پور تشریف لے گئے۔ وہاں سے لاہور ہوتے ہوے دلی فایز ہوے۔ اور چند روز کے بعد (۳ ستمبر کو) اطلاع دی کہ ابھی وہیں ٹھیرے رہیے ادھر آنے کا قصد نہ کرنا۔

۱۲ ستمبر کی شب کو قائداعظم رحلت فرما گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ پاکستان پر اندھیرا چھا گیا۔ لوگ اس خبر کو سن کر مبہوت ہوکر رہ گئے۔ دوسرے دن یہ خبر پہنچی کہ بھارت کی فوج حیدرآباد پر چڑھ آئی ہے۔ ۱۸ کو معلوم ہوا کہ ہندی فوجیں حیدرآباد میں داخل ہو گئیں۔ رو سیاہی کا وہ داغ جو کبھی بنگال اور دکن

کے چہروں پر نمایاں ہوا تھا اس تاریخ کو حیدرآباد کی پیشانی پر چمکا۔

اس کے بعد ظلم و ستم، جبر و استبداد، قتل و غارت گری، تباہی و بربادی اور فتنہ و فساد کا دروازہ کھل گیا۔ جسے دیکھ کر گاندھی جی کی اھمسا منہ چھپاتی پھرتی تھی۔ حیدرآباد کیا مٹا سات سو سال کی تہذیب اور روایات مٹ گئیں۔ بھارت کا قبضہ ہوتے ہی سب سے پہلے آردو پر آفت آئی۔ تعلیم گاھوں، دفتروں، عدالتوں، اسٹیشنوں، سڑکوں تک سے خارج کردی گئی۔ یوں تو بھارت راج نے ہر جگہ آردو دشمنی کا اظہار کیا لیکن حیدرآباد میں جس بے دردی سے اسے مٹایا ھے اس کی نظیر نہیں۔

حیدرآباد کے قبضے کے بعد اُن لوگوں پر سختی نہ رہی جن کا تعلق حیدرآباد سے تھا۔ اس لیے میں ۳ اکتوبر کو ہوائی جہاز سے دلی روانہ ھوا۔ میرے ھم سفر میرے مہربان خان عبد اللطیف خاں تھے۔ جہاز سات بجے شام کو دلی پہنچا اور شہر پہنچتے پہنچتے بہت دیر ھوگئی۔ میں نے خان صاحب سے کہا کہ مجھے مطبع مجتبائی کے مکان تک پہنچا دیجیے۔ جہاں میرے ملازم ٹھیرے ہوئے تھے۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ھوا کہ قیام کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ خان صاحب اپنی مہربانی سے مجھے اپنے ساتھ میر بدرالاسلام صاحب کے ہاں لے گئے جہاں وہ خود بھی ٹھہرنے والے تھے۔ ھم رات کو دیر سے پہنچے مگر میر صاحب بڑی مروت اور عنایت سے پیش آئے۔ دوسرے دن بھی وھیں قیام کیا۔

اس سے قبل میں لکھ چکا ھوں کہ قدوای صاحب نے یہ مشورہ دیا تھا کہ اینگلو عربک کالج جو خالی پڑا ھے انجمن کو اس میں منتقل کرلیا جائے چناںچہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے جب میں نے ذکر کیا تو آنھوں نے بڑی خوشی سے منظور کرلیا۔ میں تو کراچی اس لیے واپس چلا آیا تھا کہ مجھے دلی میں ٹھیرنے کا کوی ٹھکانا نہ ملا مگر حامد علی صاحب اور یعقوب صاحب اور دوسرے ملازم وھیں تھے۔ آنھوں نے کتاب خانہ عربک کالج میں منتقل کر دیا۔ اور اس کی اطلاع مجھے دی اور یہ بھی لکھا کہ وھاں میرے ٹھیرنے کے لیے بھی کمرے ھیں۔ اس سے مجھے اطمینان ھوگیا۔ خیال یہ تھا کہ عربک کالج کو از سر نو

چلانے میں دو سال سے کم نہ لگیں گے - لیکن ہوا یہ کہ پنجاب کے ہندو اور سکھ شرنارتھی جو دہلی میں آکر پناہ گزیں ہوئے وہ اور ان کے بال بچے ہندی نہیں جانتے تھے اردو جانتے تھے - اردو سوا عربک کالج اور اس کے ماتحت مدرسوں کے اور کہیں نہیں پڑھائی جاتی تھی - اس لئے ان شرنارتھیوں کے لڑکے لڑکیاں کثرت سے عربک کالج میں داخل ہوگئیں اور ان کی بدولت کالج پھر چل نکلا - اس لیے ہم انجمن کا سامان اور کتب خانہ پھر نمبر ۱ دریا گنج میں منتقل کرنے پر مجبور ہوگئے - اس آر جار میں کتابوں کی ترتیب میں ابتری پیدا ہوگئی اور شکست و ریخت سے نقصان پہنچا -

مولوی عبدالاحد صاحب مرحوم کے فرزند خلیق الرحمن صاحب نے اپنی مہربانی سے مطبع مجتبائی کے مکان کے اوپر کا ایک حصہ میرے قیام کے لیے معین کر دیا - دلی پہنچنے کے دو دن بعد یعنی ۵ اکتوبر ۱۹۴۸ع کو مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہوا اور حقیقت حال بیان کی کہ انجمن کے لیے کوی مکان نہیں ملتا - انجمن کے نام سے لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں - انہوں نے فرمایا کہ بہت بدگمانیاں ہیں - آپ لاہور یا کراچی کو اپنا صدر مقام بنائیے - یہ ٹھیک نہیں کہ آپ کی ایک ٹانگ یہاں ہے اور ایک وہاں - میں نے کہا میں دونوں جگہ کام کرنا چاہتا ہوں بلکہ اس سے بھی آگے افغانستان ، ایران ، چین ، عرب ، انڈونیشیا وغیرہ میں - رہی بدگمانیاں تو ان کے رفع کرنے کی یہی صورت ہے کہ زبان اور کلچر جو پاکستان اور بھارت کی اکثر آبادی میں مشترک ہے اس کے لیے پوری آزادی ہو - خصوصاً اردو کے لیے جو یہاں کے کروروں انسانوں کی زبان ہے - کہا یہ ٹھیک ہے لیکن موجودہ حالات ایسے نہیں کہ آپ یہاں کام کریں - میں نے کہا آپ تعزیرات ہند میں ایک دفعہ کا اضافہ کیوں نہیں کر دیتے کہ ہمیشہ کے لیے جھگڑا ہی ختم ہوجائے - جناب کیفی صاحب سے ملا وہ اس سے قبل ڈاکٹر تارا چند سے ملے تھے انہوں نے بھی ایسی ہی باتیں کیں - جس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت ہم سے بدگمان ہے -

اب ہمارا کام فی الحال یہ رہ گیا تھا کہ صبح نکلتے کے بعد کتب خانے جاتے ، کتابوں کی ترتیب درست کرتے اور جو خراب اور شکستہ ہوگئی تھیں یا بارش

کی وجہ سے جن کی حالت بہت ابتر ہوگئی تھی ان کو الگ رکھتے جاتے ۔ شام کو قیام گاہ پر واپس آتے ۔ ایک ہفتے کے بعد میں (۱۲ اکتوبر کو) پھر مولانا ابوالکلام آزاد سے ملا اور کہا کہ میں نے آپ کی تجویز پر غور کیا اور بعض دوستوں سے بھی مشورہ کیا ۔ یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انجمن کو ہم کراچی لے جائیں ۔ اس صورت میں ہمیں کتب خانہ لے جانے کی سہولت ملنی چاہیے اور جو رقم انجمن نے حکومت ہند کو زمین کی قیمت میں ادا کی تھی وہ واپس ہونی چاہیے ۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ مجھے لکھیے ، یہ دونوں باتیں آسانی سے ہوجائیں گی ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے بھی مجھ سے یہی فرمایا کہ ظاہر ہے آپ اپنا اصول نہیں بدلیں گے ، اس لیے یہاں رہ کر کام کرنا آپ کے حق میں مناسب نہ ہوگا ۔

غور کرنے کے بعد میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ اس معاملے کو انجمن کی مجلس نظما میں پیش کر دیا جائے ۔ چناں چہ ارکان مجلس نظما کو اطلاع کردی گئی کہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۸ع کو مجلس کا ضروری جلسہ حبیب منزل علی گڑھ میں ۴ بجے ہوگا ۔

حامد علی صاحب کی پرمٹ کی مدت ختم ہو رہی تھی میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو لکھا کہ وہ مہربانی فرماکر حامد علی صاحب کو اپنے ساتھ ڈپٹی کمشنر صاحب کی خدمت میں لے جائیں اور ان کے پرمٹ میں توسیع کرادیں ۔ اس وقت یہاں میرے پاس کوئی آدمی نہیں چند روز ان کا میرے ساتھ رہنا بہت ضروری ہے ۔ ڈاکٹر صاحب حامد علی صاحب کو لے گئے لیکن ڈپٹی کمشنر بری طرح پیش آیا ڈاکٹر صاحب کا بھی کچھ خیال نہ کیا بلکہ کہنے لگا کہ اس قسم کے معاملات میرے پاس نہ لایا کریں ۔ توسیع کا کوی وعدہ نہ کیا اور کہا پولیس سے دریافت کروں گا حامد علی صاحب عجیب شش و پنج میں تھے ۔ صرف ایک دن کی مہلت باقی تھی ۔ اگر وہ نہیں جاتے اور یہیں ٹھیرے رہتے ہیں تو پولیس گرفتار کرلے گی ۔ ڈپٹی کمشنر کا کوئی اعتبار نہیں توسیع دے یا نہ دے ۔ اس کے تیور اچھے نہیں معلوم ہوتے ۔ حامد علی صاحب نے آخر مجھ سے پوچھا کہ کیا کروں ۔ میں نے کہا کہ قانون کی پابندی کرنی چاہیے آپ فوراً کراچی چلے جایے ۔ اگر ڈپٹی کمشنر توسیع کا وعدہ

کرتا تو ٹھیرنے میں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ غرض حامد علی صاحب روانہ ہوگئے۔ یہ ۱۷ اکتوبر کا واقعہ ہے۔ اسی تاریخ کو یہ معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے نمبر۱ دریاگنج میں انجمن کے کتب خانے کو مقفل کرکے سر بہ مہر کردیا ہے۔ اس اطلاع سے مجھے بہت پریشانی ہوئی۔ دوسرے دن مولانا ابوالکلام آزاد سے ملا اور اُن سے حقیقت حال بیان کی۔ انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کچھ اندیشے کی بات نہیں۔ میں چیف کمشنر سے فون کرکے دریافت کروں گا۔ دو روز بعد میں پھر مولانا سے ملا تو اُنھوں نے معذرت کی اور کہا میں بھول گیا اب دریافت کروں گا۔ میں نے اُن کو مجلس نظما کے اجلاس کا دعوت نامہ دیا اور اس لفافے میں اپنا نجی خط بھی رکھ دیا جس میں ان کے اطیمنان کے لیے یہ لکھ دیا تھا کہ آپ کی تجویز سے مجھے اتفاق ہے اور یہ معاملہ مجلس نظما میں پیش کرکے قطعی فیصلہ کرلیا جائے گا۔

۲۰ اکتوبر کو آنریبل مسٹر رفیع قدوائی سے ملا۔ اور اُن سے تمام کیفیت بیان کی۔ اُنھوں نے کہا ڈپٹی کمشنر سے ملیے۔ میں نے کہا وہ بہت بدتمیز ہے میں اس سے نہیں ملوں گا اور اُن سے ڈاکٹر ذاکر حسین اور حامد علی کی ملاقات کا حال بیان کیا۔ کہا کہ میں چیف کمشنر سے دریافت کروں گا، آپ اُن سے ملیے۔ میں چوں کہ الہ‌باد جانے والا تھا نہ مل سکا۔ البتہ خط لکھ کر اصل کیفیت سے اطلاع کردی اور کتب خانے پر سے بندش اُٹھانے کی درخواست کی۔

میں نے مولانا کی خدمت میں جو مجلس نظما کے جلسے کے اطلاع نامہ کے ساتھ اپنا نجی خط دیا تھا اس کے جواب میں مولانا کا خط وصول ہوا۔ مولانا کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں میں مجلس نظما میں وہ سب باتیں نہ کہدوں جو اُنھوں نے مجھ سے اس بارے میں فرمائی تھیں اور اس غلط گمان پر اُنھوں نے خود ہی اپنے بیان کی تردید کرنے کی تکلیف فرمائی۔ ان کا قیاس در حقیقت ان کے دل کا چور تھا۔ میں دونوں خط یہاں نقل کرتا ہوں۔ اُن کو پڑھنے کے بعد آپ کو مولانا کی غلط بیانیوں پر اسی قدر افسوس ہوگا جس قدر مجھے ہوا۔ لیکن جس بات سے مجھے سخت تکلیف اور رنج ہوا وہ مولانا کا یہ فقرہ تھا۔

”آپ کو معلوم ہے کہ گرانٹ کی درخواست انٹرم گورنمنٹ کے زمانے میں کی گئی تھی۔ اُس وقت مالیات کا صیغہ مسٹر لیاقت کے ہاتھ میں تھا۔ اُنھوں نے گرانٹ دینے سے انکار کردیا تھا،،

اسی کے معنی ہیں دروغ گویم بر روئے تو۔ امداد کی درخواست دینے والا میں تھا اور میری موجودگی میں نواب زادہ لیاقت علی خاں نے اس کی منظوری دی اور میں نے اس کے بعد بار بار مولانا سے اجرائے امداد کا تقاضا کیا اور وہ ٹالتے رہے میرے جواب میں اس واقعہ کی تفصیل موجود ہے۔ میں مولانا کی ایمانی لچک سے تو واقف تھا لیکن یہ بات میرے خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ وہ ایسی صریح خلاف واقعہ بات کہیں گے۔

نقل خط جناب مولانا ابوالکلام آزاد

دہلی ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۸ع

جناب من! آپ اپنے خط مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۸ع میں لکھتے ہیں ''آپ نے انجمن کے متعلق جو مشورہ دیا تھا، اس سے مجھے اتفاق ہے،، ''مشورہ،، سے مقصود غالباً یہ معاملہ ہے کہ اب انجمن ترقی اردو کو پاکستان منتقل کردیا جائے اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ نے صورت حال کی جو تعبیر کی ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ براہ عنایت اپنے فیصلہ کو میرے مشورہ کا جامہ نہ پہنائیے۔

اس سلسلہ میں جو حالات پیش آئے وہ حسب ذیل ہیں: دہلی کے فساد کے بعد جب آپ آئے تو آپ نے مجھے یقین دلایا کہ انجمن بدستور اپنے کاموں کو یہاں جاری رکھنا چاہتی ہے اور آپ ایک نیا مکان دفتر کے لیے ڈھونڈھ رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ کراچی چلے گئے اور ایک عرصہ تک کوئی خبر آپ کی نہیں ملی اب آپ آئے تو آپ کے پرمٹ سے معلوم ہوا کہ آپ نے انڈین یونین کی سکونت ترک کردی ہے اور پاکستان کے باشندہ ہونے کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ ساتھ ہی معلوم ہوا کہ کراچی میں آپ نے ایک مکان حاصل کرلیا ہے اور انجمن کو وہاں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ چند دنوں کے بعد جب آپ مجھ سے ملے تو میں نے یہ رائے ظاہر کی کہ تعطل و تعلیق کی موجودہ صورت حال جلد سے جلد ختم کر دینی چاہیے آپ نے ایک قدم پاکستان میں جمایا ہے، دوسرا یہاں رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ طرز عمل انجمن کے لیے سود مند نہ ہوگا۔ اس پر آپ نے کہا کہ آپ کو کراچی میں ایک بہت اچھا مکان مل گیا ہے اور آپ چاہتے ہیں انجمن کو وہاں منتقل کر دیں۔ پس

اس بارے میں آپ نے جو رائے بھی قائم کی ہے آپ کی رائے ہے۔ اسے میرے مشورے سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہوسکتا۔

جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے میں بار بار یہ خیال ظاہر کرچکا ہوں کہ انجمن ہندستان میں قائم ہوئی تھی اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کیوں وہ اپنا کام یہاں جاری نہ رکھے؟ جہاں تک گورنمنٹ آف انڈیا کا تعلق ہے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی خواہش مند نہیں ہے کہ انجمن اپنے کاموں کو یہاں بند کردے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسی سال ایجوکیشن منسٹری نے انجمن کے لیے ایک گرانٹ منظور کی ہے اور اسے کام میں نہ لانے کی پوری ذمہ داری ارکان انجمن کے سر ہے۔ چار لاکھ عمارت کے لیے اور چالیس ہزار سالانہ انجمن کے کاموں کے لیے گورنمنٹ منظور کرچکی ہے ظاہر ہے کہ جو گورنمنٹ انجمن کو گرانٹ دے رہی ہے وہ انجمن کے اجراء کار کی مخالف کیسے ہوسکتی ہے؟

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ گرانٹ کی درخواست انٹرم گورنمنٹ کے زمانے میں کی گئی تھی۔ اس وقت مالیات کا صیغہ مسٹر لیاقت علی کے ہاتھ میں تھا انھوں نے گرانٹ دینے سے انکار کردیا تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب نئی قومی حکومت بنی تو اس کے عہد میں ازسر نو یہ معاملہ اٹھایا گیا اور گرانٹ منظور کی گئی۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انجمن پورے سکون اور جمعیت کے ساتھ اپنے کاموں کو آگے بڑھا سکتی ہے۔ بشرطیکہ کام کرنے کا ارادہ ہو۔ میں چاہتا ہوں اس سلسلہ میں کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو اس لیے مہربانی کرکے یہ خط ۲۶ اکتوبر کے مجوزہ جلسہ کے سامنے پیش کردیا جائے۔

والسلام

(شرح دستخط) ابوالکلام

اس کے جواب میں حسب ذیل خط میں نے مولانا کو تحریر کیا:-

دھلی - مطبع مجتبائی، چوڑی والان- دھلی

مورخہ ۲۰ اکتوبر ۴۸ء -

جناب والا - گرامی نامہ پہنچا - میں نے اپنے خط میں جو پرایویٹ تھا۔ جس میں صرف آپ کے مشورہ کا لفظ تھا اور اس کی کوئی تصریح نہیں کی تھی کیونکہ وہ گفتگو پرایویٹ تھی اور میرا مطلق ارادہ نہ تھا کہ مجلس نظما میں اس کا حوالہ

دیا جاتا ۔ لیکن اب چونکہ آپ نے خود یہ خواہش ظاہر فرمائی ہے کہ آپ کا خط جلسے میں پیش کر دیا جائے لہذا مجھے مجبوراً اس گفتگو کا حوالہ دینا پڑے گا ۔

اس میں مطلق شبہ نہیں کہ میں بدستور یہاں کام کرنا چاہتا تھا اور اب بھی یہاں کام کرنے کے لیے آمادہ ہوں اس سے قبل حیدرآباد بھوپال سے آیا اور اب کراچی سے اسی نیت سے آیا ہوں ۔ لیکن باوجود کامل سعی اور تگ و دو اور آپ کی عنایت کے کوئی مناسب مکان نہیں ملا جس میں انجمن کا دفتر اور اس کا کتب خانہ وغیرہ رکھا جاسکے ، یہاں تک کہ مجھے اپنے ٹھہرنے کے لیے بھی کوئی جگہ نہ ملی ۔ پہلی بار آپ کے یہاں چند روز قیام کیا اور پھر نظام پیلس گیسٹ ھاؤس میں جاکر رہا ۔ دوسری مرتبہ زاہد حسین صاحب کے یہاں مہمان رہا ۔ اور جب مکان کی دستیابی میں مطلق کامیابی نہ ہوئی اور زاہد حسین صاحب کا تبادلہ بھی کراچی ہوگیا اور میرے قیام کی بھی دلی میں کوئی جگہ نہ رہی تو مجبوراً کراچی چلا گیا ۔ وہاں میں نے پاکستان کے لیے ایک الگ مرکز قائم کیا ۔ کیونکہ تقسیم کے بعد انجمن کی آن شاخوں کا الحاق دھلی کے مرکز سے نہیں ہوسکتا تھا جو پاکستان میں تھیں ۔

جن حالات کا آپ نے اپنے خط میں ذکر فرمایا ہے وہ اکثر غلط اطلاع پر مبنی معلوم ہوتے ہیں ۔ آپ نے میرا پرمٹ ملاحظہ نہیں فرمایا ورنہ آپ یہ تحریر نہ فرماتے کہ میں نے انڈین یونین کی سکونت ترک کر دی ہے اور پاکستان کے باشندہ ہونے کی حیثیت حاصل کرلی ہے ۔ میرے پرمٹ میں مجھے ہندستانی لکھا ہے ، پاکستانی نہیں لکھا ۔ میں نے بے شک کراچی میں انجمن کے لیے ایک مکان حاصل کیا ہے لیکن میں نے اس انجمن کو وہاں منتقل نہیں کیا ۔ انجمن کا تمام سامان دفتر اور کتب خانہ یہاں دھلی میں موجود ہے ۔ کراچی میں پاکستان کے لیے بالکل الگ مرکز قائم ہے جس کا کوئی تعلق دھلی کے مرکز سے نہیں ہے اور اس کی وجہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں ۔ تعطل و تعلیق کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ جس مکان میں انجمن تھی فساد کے زمانے میں اس پر بھارت انشورنس کمپنی کا قبضہ ہوگیا اور انجمن کا دفتر اور سامان اور میرا ذاتی اسباب لوٹ لیا گیا ۔ باقی جو کچھ بچ رہا اب تک یہیں پڑا ہے ۔ صرف انجمن کا کتب خانہ اس مکان کے ایک حصے میں اب تک موجود ہے ۔ اگرچہ بار بار کوشش

کرنے پر بھی مکان نہیں ملا - تاہم انجمن کا کام برا بھلا جاری رہا اور اب تک جاری ہے - جب مجھے باہر جانا پڑا تو میرے دفتر کے منیجر اور منشی وغیرہ برابر یہاں رہے اور کام کرتے رہے -

حال میں جب میں دلی آیا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو بلاشبہ آپ نے یہ فرمایا کہ آپ کی ایک ٹانگ یہاں ہے ایک وہاں ، یہ ٹھیک نہیں - آپ نے اب جہاں مرکز بنایا ہے وہیں رکھیے - لاہور اس کے لیے زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ کام کرنے والے وہیں ہیں - کراچی اس لحاظ سے زیادہ مناسب نہیں - میں نے عرض کیا کہ " ہم دونوں جگہ کام کرنا چاہتے ہیں - زبان اور کلچر کے لیے کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے - بلکہ ہم تو ہندستان اور پاکستان کے باہر بھی اس کام کو کرنا چاہتے ہیں " - آپ نے فرمایا - " بدگمانیاں بہت ہیں اور حالات ناسازگار ہیں " میں نے عرض کیا کہ بدگمانیاں رفع کرنے کی یہی صورت ہے کہ زبان اور کلچر کی اشاعت پر کوئی پابندی نہ ہو اور اردو تو باہمی اتحاد اور یک جہتی کی پیداوار ہے - اس پہلی ملاقات کے بعد دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ دلی کے بعض احباب سے بھی اس بارے میں مشورہ کیا ان کی بھی وہی رائے ہے جو آپ نے ظاہر فرمائی ہے اور مجھے بھی اتفاق ہے - آپ نے اس پر مسرت کا اظہار فرمایا - اس کے بعد میں نے کہا کہ اگر ایسی صورت ہوئی تو ہمیں انجمن کے سامان اور کتب خانے وغیرہ کے منتقل کرنے میں پوری سہولت ملنی چاہیے اور جو رقم انجمن نے نئی دہلی میں زمین خریدنے کے لیے حکومت ہند کو ادا کی ہے وہ بھی واپس ملنی چاہیے - آپ نے فرمایا کہ مجھے لکھ بھیجیے - دونوں کام بہت آسانی سے ہوسکتے ہیں - لیکن میں نے اس بارے میں آپ کو نہیں لکھا - کیونکہ جب تک مجلس نظما میں معاملے کو پیش کرکے منظوری حاصل نہ کی جائے مجھے ایسا کرنے کا کوئی حق حاصل نہ تھا - چنانچہ اسی بنا پر اب یہ معاملہ مجلس نظما میں پیش کیا جارہا ہے -

یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ مسٹر لیاقت علی خاں نے گرانٹ دینے سے انکار کر دیا تھا - مجھے اس کا ذاتی علم ہے اور یہ منظوری انہوں نے خاص طور پر دی اور میں نے بذات خود اس تحریر کو دیکھا ہے - اس کے بعد میں نے ڈاکٹر سین سے کہا کہ جب گرانٹ منظور ہوچکی ہے تو اسے جاری کیوں نہیں کیا جاتا - انہوں نے کہا

کیبنٹ میں یہ معاملہ پیش کیا جائے گا ۔ میں نے کہا کہ جب فنانس منسٹر کو کوئی اعتراض نہیں اور نہ کسی اور کو تو پھر کیبنٹ میں پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے ۔ میں نے دہلی نیز شملے حاضر ہو کر بار بار آپ کی خدمت میں گزارش کی کہ گرانٹ منظور ہوچکی ہے اجراء کے احکام ہو جانے چاہئیں لیکن بعض وجوہ کی بنا پر جن کا علم مجھے نہیں ، اس معاملے میں ڈپارٹمنٹ کی طرف سے برابر تساہل ہوتا رہا اور سرکاری طور پر انجمن کو اب تک یہ اطلاع نہیں دی گئی کہ کس قدر رقم منظور کی گئی ہے ۔ حال میں جب میں نے سکرٹری صاحب تعلیمات کو اس کے متعلق لکھا تو انہوں نے ایک مبہم سا جواب دیا جس سے کچھ معلوم نہ ہوسکا ۔ جب اس کی تصریح طلب کی گئی تو کوئی جواب نہ ملا ۔ انجمن پر یہ الزام غلط ہے کہ اس نے گرانٹ حاصل نہیں کی اور اسے کام میں نہیں لائی ۔

مجھے یہ معلوم کر کے نہایت خوشی ہوئی کہ گورنمنٹ انجمن کے اجرائے کار کی مخالف نہیں ۔ لیکن جو برتاؤ ہمارے ساتھ کیا جا رہا ہے وہ بہت قابل افسوس ہے ۔ سی آئی ڈی ہمارے درپے ہے اور ہماری آمد و رفت اور ہمارے ہر کام کی نگرانی کی جاتی ہے ۔ پولیس نے ہمارے کتب خانے پر مہر کردی ہے اور ہمیں اس میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ۔ اور دو مسلح سپاہی شب و روز وہاں پہرا دیتے ہیں تاکہ ہم وہاں نہ جاسکیں ۔ اس سے انجمن کے وقار اور کام کو بڑا نقصان پہنچا ۔ اس برتاؤ کے بعد ہمیں کام کرنے میں کیا مسرت ہوسکتی ہے اور ہمیں کیونکر یقین ہوسکتا ہے کہ گورنمنٹ ہماری حامی و مددگار ہے ۔

خادم

(شرح دستخط) عبدالحق

دوسرے دن یعنی ۲۱ اکتوبر کو میں الہ آباد روانہ ہوگیا ۲۲ اکتوبر کو سر تیج بہادر سپرو سے ملا ۔ اُن کی حالت دیکھ کر مجھے بہت قلق ہوا ۔ ہاتھ پاؤں کام نہیں دیتے تھے آواز بھی بہت دھیمی ہوگئی تھی ۔ ملازم سگرٹ سلگا کر ان کی انگلیوں میں رکھ دیتا تھا ۔ وہ اس کی راکھ تک نہیں جھاڑ سکتے تھے ۔ ملازم ان کے ہاتھ سے لے کر اور راکھ جھاڑ کر پھر ان کی انگلیوں میں لگا دیتا ۔ لیکن دماغ اور حافظہ بدستور تھا ۔ انجمن پر جو کچھ گزری تھی وہ سب کیفیت میں نے اُن سے بیان کی تو سن

کر بہت افسوس کیا اور بڑے درد بھرے الفاظ میں فرمایا "اب اردو کا نام لینا جرم ہے"، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب جو میرے ساتھ تھے اُن سے فرمایا کہ جب جواہر لال واپس آجائیں تو مجھ سے اُن کے نام خط لکھوالینا تاکہ میں یعنی عبدالحق اس کے ذریعہ پنڈت جواہر لال سے مل سکیں۔

۲۴ اکتوبر کو ہندستانی اکیڈیمی کی کونسل کا جلسہ تھا اس میں شریک ہوا۔ اس میں اردو کے ختم کرنے اور اکیڈیمی کو حسب منشائے حکومت ہندی اکیڈیمی بنانے کا مسئلہ پیش تھا۔ اکیڈیمی میں آج اردو کا قل تھا اور میں فاتحہ پڑھ کر واپس آگیا۔ شب کی گاڑی سے علی گڑھ روانہ ہوا۔

۲۶ کو ۴ بجے حبیب منزل (دولت کدہ مولوی حبیب الرحمن خان صاحب شروانی) میں انجمن کی مجلس نظما کا جلسہ قرار پایا تھا یہ تاریخ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے مشورے سے مقرر کی گئی تھی مگر باوجود وعدے کے وہ کسی ضروری کام کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ ان کا خط ہمیں مل گیا تھا۔ بعد معذرت کے تحریر فرمایا کہ "معاملہ زیر غور کے متعلق میری جو رائے ہے وہ لکھتا ہوں:—

میری رائے ہے کہ اردو کی ترقی و ترویج کا کام ہندستان میں اب پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اس لئے اس کام کا کوئی نہ کوئی انتظام ہونا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی میری یہ رائے بھی ہے کہ انجمن ترقی اردو کے کام کی جو نوعیت گزشتہ چند سال میں رہی اس کے پیش نظر موجودہ کارکنوں کا یہاں کام کرنا بہت دشوار ہوگا۔ انھیں پاکستان میں اردو کی خدمت میں زیادہ سہولت ہوگی اور وہاں وہ مفید کام انجام دے سکیں گے۔ اس لئے انھیں وہاں کام کرنا چاہئے اور یہاں خدمت اردو کے لئے کوئی دوسرا انتظام ہونا چاہئے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے لئے دوسرے کارکن مقرر کر کے اسے یہاں قائم رکھا جائے۔ اور موجودہ کارکن پاکستان میں دوسری انجمن قائم کرلیں۔ میری رائے ہے کہ پاکستان اور ہند کے سیاسی تعلقات کی موجودہ حالت میں یہ غیر مناسب ہوگا کہ پاکستان اور ہندستان کے اس کام میں کوئی انتظامی یا شخصی تعلق رہے۔ والسلام"، نصاب پورا نہ ہونے کی وجہ سے جلسہ ملتوی کیا گیا اور ۲۷ اکتوبر کو قرار پایا۔ ایک آدمی خاص طور پر ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کی خدمت میں روانہ کیا گیا تاکہ وہ اس روز ضرور شرکت فرمائیں۔ مگر

وہ اس روز بھی نہ آسکے - جلسے میں ، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی جناب کیفی صاحب شریک رہے - جس میں چند قراردادیں منظور ہوئیں -

۲۸ اکتوبر کو میں اور کیفی صاحب دھلی روانہ ہوگئے مولوی بشیرالدین صاحب (اٹاوہ) بھی میرے ساتھ آئے اور میرے پاس قیام کیا - یہاں آکر معلوم ہوا کہ سر تیج بہادر سپرو نے باوجود شدت مرض میری ملاقات کے دوسرے ہی دن ۲۳ اکتوبر کو ایک خط ڈاکٹر تارا چند کو اور دوسرا مسٹر شنکر پرشاد چیف کمشنر کو لکھا اور انجمن کے معاملے کی طرف توجہ دلائی - چیف کمشنر کے خط میں انھوں نے انجمن سے اپنے تعلق کا اظہار کیا اور میرے نسبت چند کلمات لکھے - ان دونوں خطوں میں انھوں نے یہ بھی لکھا کہ انجمن نے کبھی سیاسی امور میں دخل نہیں دیا - یہ سچ ہے کہ اس کا مقصد اردو کی ترقی و اشاعت ہے - لیکن قانون کی رو سے یہ کوئی جرم نہیں - اگرچہ صوبجات متحدہ کی حکومت ہندی کے حق میں بڑا جوش خروش دکھا رہی ہے اور بعض دوسری حکومتوں نے بھی ہندی کو لنگوا فرینکا قرار دیا ہے - چیف کمشنر کے خط میں سر تیج بہادر نے یہاں تک لکھا کہ میں بذاتہ خود دلی آکر آپ سے اس معاملے پر گفتگو کرتا لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں فالج کی وجہ سے صاحب فراش ہوں اور کہیں آنے جانے کے قابل نہیں - میں نہایت ممنون ہوں گا اگر آپ انجمن کا معاملہ ٹھیک ٹھاک کردیں گے - چیف کمشنر نے سر تیج بہادر کے خط کا جو جواب لکھا اس کی نقل سر تیج نے مجھے بھیج دی - اسے پڑھ کر مجھے بہت افسوس ہوا - اس میں بھی طرح طرح کی غلط بیانیاں ہیں - جو پولیس نے کہہ دیا وہ پتھر کی لکیر ہے - یہی انگریزی حکومت میں ہوتا تھا - اور یہی اب ہورہا ہے - میں نے سر تیج بہادر کو سچے حالات لکھ بھیجے اور ان بدگمانیوں اور غلط بیانیوں کی تردید کی جو چیف کمشنر نے اپنے خط میں بیان کی تھیں - اس کی نقل یہاں درج کرتا ہوں - اس سے سارا معاملہ آئینہ ہوجائے گا -

نقل خط موسومہ جناب سر تیج بہادر

دھلی - خلیق منزل محلہ چوڑی والان -

۱۶ - نومبر ۴۸ ع

جناب مخدوم و محترم مد ظلہ ، تسلیم

ڈاکٹر صدیقی صاحب نے مجھے مسٹر شنکر پرشاد چیف کمشنر دھلی کے خط

موسومۂ آنجناب کے اس حصے کی نقل بھیجی جو انجمن کے متعلق تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ یہ خط پولیس کی غلط اطلاعات پر مبنی ہے۔ میں دلی میں موجود تھا۔ اگر مجھے طلب کر کے دریافت حال فرما لیتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ غالباً انھیں پولیس پر زیادہ اعتماد ہے اور پولیس کا جو حال ہے وہ سب پر روشن ہے۔

یہ سچ ہے کہ انجمن کے مکان پر جب حملہ ہوا اور اس کا سامان اور اسباب لوٹ لیا گیا تو اس کے بعد انجمن کے بعض ملازمین کی تگ ودو اور کوشش سے پولیس کا پہرہ مقرر کر دیا گیا تھا جو کچھ دنوں کے بعد ہٹا لیا گیا۔ میں اور انجمن کے دو اور کارکن شروع نومبر ۱۹۴۷ع میں دلی پہنچے تو دیکھا کہ انجمن کا دفتر تباہ کردیا گیا ہے اور اس کے رجسٹر، مسلیں اور دوسرے کاغذات تلف کر دیئے گئے ہیں۔ میرا ذاتی سامان سب کا سب لوٹ لیا گیا ہے۔ موٹر توڑ پھوڑ دی گئی ہے غسل خانوں باورچی خانوں، گدام، وارنڈوں اور ایک دو کمروں میں ردیوں کے بڑے بڑے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ ہم نومبر ۱۹۴۷ع سے اب تک بچے کھچے سامان کی درستی اور تلاش اور معمولی دفتر کے کام میں لگے رہے۔ ردیوں کے انباروں کی چھٹائی میں کئی مہینے لگ گئے۔ ان ردیوں کا ایک ایک کاغذ دیکھا گیا۔ ان میں کچھ پھٹے پھٹائے کاغذ، بعض قلمی نسخوں کے کچھ متفرق ورق ایک انبار میں کچھ دوسرے میں اور کوئی ورق کہیں ایک جگہ اور کوئی دوسری جگہ ملا۔ ان کو ہم جوڑ کر درست کرتے رہے۔ تو بھی ادھورے اور ناقص رہے۔ بعض پھٹ پھٹا کر گل گلا کر بالکل بیکار ہوگئے اور بعض کا پتہ نہ لگا۔

علاوہ کتب خانے کے مکان کی کتابوں کا ایک خاصا حصہ اس بڑے کمرے میں تھا جس میں لغت وغیرہ کا کام کیا کرتا تھا۔ اس میں کچھ کتابیں کھلی الماریوں میں تھیں اور کچھ دو فولادی الماریوں میں مقفل تھیں۔ لٹیروں نے یہ سمجھ کر کہ ان میں زر و مال ہوگا ان کو توڑا اور جب ان میں ان کے کام کی کوئی چیز نہ ملی تو غصے کی جھانجھ میں کتابیں اور کاغذات اٹھا اٹھا کر باہر پھینک دیے۔ ان میں بہت سے نادر قلمی نسخے اور کاغذات، اردو لغت اور نئی طبع ہونے والی کتابوں کے مسودے بھی تھے۔ چونکہ مکان پر بھارت انشورنس کمپنی کا قبضہ ہوگیا تھا اور اس کو کمرے خالی کرانے کی ضرورت تھی اس لیے لوٹ سے جو چیزیں بچیں وہ باہر

صحن میں پھینک دی گئیں۔ اور کچھ دنوں تک وھیں پڑی رھیں ۔ اس کے بعد مالک مکان نے مزدوروں سے آٹھوا کر غسل خانوں ، باورچی خانوں اور برآمدوں وغیرہ میں پھٹے پرانے کاغذوں اور اخباروں کی ردیوں کے ساتھ ڈلوادیں ۔ ان ردیوں میں سے کچھ چیزیں مسخ اور شکستہ حالت میں ملیں اور باقی تلف ھوگئیں ۔

مولوی حامد علی صاحب کا ذکر اس خط میں اس طرح کیا گیا ھے کہ گویا وہ ایک غیر اور مشتبہ شخص ھیں ۔ یہ بات نہیں ھے ۔ وہ دفتر انجمن کے منیجر ھیں جو کئی سال سے کام کر رھے ھیں گزشتہ فسادات کے زمانے میں بھی دلی میں تھے ۔ جب حملہ آوروں کا زور ھوا تو وہ بعض دوسرے ملازمین کی طرح پریشانی کے عالم میں جان سلامت لے کر نکل گئے ۔ جو رہ گئے ۔ وہ قتل کر دے گئے حامد علی صاحب کے بیوی بچے کسی ھم درد کے توسط سے ھوائی جہاز کے ذریعے کراچی جا پہنچے اُن کی خبر گیری کے لیے یہ بھی وھاں چلے گئے ۔ اُن کے عزیزوں کے رھنے سہنے کا انتظام ھوگیا تو وہ میرے ساتھ جنوری ۱۹۴۸ع میں دلی آ گئے ۔ اس عرصے میں برابر کتابوں اور سامان کی درستی اور ردیوں کی چھٹائی اور دفتر کا انتظام ھوتا رھا ۔ اور اس کے ساتھ برابر یہ کوشش ھوتی رھی کہ کوئی مناسب مکان مل جائے تو انجمن کو اُس میں منتقل کر دیا جائے ۔ . . . .

چیف کمشنر صاحب نے اپنے خط میں یہ بھی تحریر فرمایا ھے کہ پاکستان سے کسی شخص کو بلانے کی کیا ضرورت تھی ۔ کیا یہاں کوئی آدمی اس کام کے لیے نہیں مل سکتا تھا ۔ بلاشبہ یہاں ھمارے کام کے لیے ایسا کوئی آدمی نہیں مل سکتا تھا کیونکہ حامد علی صاحب انجمن کے منیجر کی حیثیت سے تمام کاروبار اور حسابات اور مراسلت وغیرہ سے پورے طور پر واقف تھے ۔ اور فسادات کے بعد بچے کھچے کاغذات اور سامان سمیٹ کر اُنھیں نے رکھا تھا اس لیے وھی ان چیزوں کی نشان دھی اور پڑتال کر سکتے تھے ۔ نیز انجمن کے حسابات وغیرہ کی کیفیت بھی اُنھیں سے معلوم ھوسکتی تھی ۔ کوئی غیر شخص یہ کام نہیں کر سکتا تھا ۔

چیف کمشنر صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا ھے کہ نودس قلمی کتابیں لائبریری سے غائب ھوگئی ھیں ۔ یہ اُنھیں کیونکر معلوم ھوا ؟ ۔ اس میں شک نہیں کہ قتل و غارت گری کے زمانے میں بعض قلمی نسخے ، قیمتی کاغذات

مثلاً ناسخ ، غالب ، سرسید احمد خاں ، مولانا حالی ، نواب محسن الملک ، نواب عمادالملک ، ڈاکٹر اقبال وغیرہ کے خطوط اور بعض قدیم فرامین اور خاص کر میری اردو لغت کے مسودے جو میری عمر بھر کی تحقیق اور محنت کا نتیجہ تھے تلف ہو گئے۔جس کامجھے سخت صدمہ ہے۔ حامد علی کبھی تنہا کتب خانے میں نہیں گئے - میں اپنے ساتھ لے کر جاتا تھا اور کتب خانے کی کنجی میرے پاس رہتی تھی۔ وہ وہاں سے کوئی کتاب نکال کر نہیں لائے البتہ میں وہاں سے کچھ بچے کھچے کاغذات اور پرچے (زیر تالیف اردو لغت کے) اور بعض کتابیں اپنی قیام گاہ پر لے آیا کیونکہ میں یہاں بیکار نہیں رہنا چاہتا تھا ادبی کام جو کر رہا تھا یہاں بھی کرتا رہتا ہوں ۔کچھ کتابیں ایسی بھی لایا جوسیل گئی تھیں - انھیں صاف کر کے دھوپ دکھانے کی ضرورت تھی - اس میں کوئی ناجائز بات نہیں ہے - یوں بھی جب کبھی موسم گرما میں یا کسی دوسری ضرورت سے کسی دوسرے مقام پر چلاجاتا تو بہت سی کتابیں اپنے ساتھ لے جاتا تھا - چوں کہ موجودہ کتب خانے کے مکان میں کام کرنے کی کوئی جگہ نہیں اس لیے وہاں سے اپنی قیام گاہ پر کتابیں لانا کوئی جرم نہیں - یہ میں ہمیشہ کرتا رہا ہوں - بلکہ بعض یونی ورسٹیوں کو بھی ان کی درخواست پر بعض کتابیں مستعار بھیجتا رہا ہوں -

یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ ہم کتابیں پاکستان لے جانا چاہتے ہیں - اگر ہمارا یہ منشا ہوتا تو اس زمانے میں جب کہ نہ پرمٹ کا جھگڑاتھا نہ کسٹم کا ہم آسانی سے لے جاسکتے تھے - لیکن ہم نے کبھی اس کا خیال تک نہیں کیا -

ایک بات یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس کتاب خانے میں بہت بڑا حصہ میری ذاتی کتابوں کا ہے - انجمن کی کتابیں کم ہیں - کیوں کہ ابتدا میں برسوں تک انجمن کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ کتابوں کے خرید نے پر کثیر رقم صرف کرتی اس لیے سارا علمی ادبی کام میرے ذاتی کتاب خانے پر چلتا تھا میں نے اپنی عمر بھر کی کمائی کا رپیہ پیسہ باقاعدہ اعلان کر کے انجمن کے نذر کر دیا - لیکن میں نے اپنا کتب خانہ ابھی تک انجمن کو نہیں دیا ہے - انجمن میں امانتاً رکھ دیا ہے - تاکہ میرے علاوہ دوسرے علم و ادب کے شایقین بھی اس سے مستفید ہو سکیں - چنانچہ اکثر اہل علم اور بعض یونی ورسٹیوں کے ری سرچ اسکالر

اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنا کتب خانہ اس انجمن یا کسی دوسرے ادارے کو اس لیے نہیں دیا کہ اگر حالات میں کبھی انقلاب ہوا یا میں انجمن کی خدمت سے سبکدوش ہوگیا تو میں اپنے علمی و ادبی کاموں میں حسب منشا اس سے پوری آزادی کے ساتھ کام نہ لے سکوں گا۔ آج جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ خود مجھے اپنی کتابوں سے استفادہ کرنے سے محروم کیا جا رہا ہے تو میری یہ دور بینی اور احتیاط اس وقت میرے کام آئی چنانچہ علی گڑھ کے اجلاس نظما میں یہ فیصلہ کردیا گیا ہے کہ میں اپنی ذاتی کتابیں جہاں چاہے لیجاسکتا ہوں انجمن کے کتب خانے میں پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب کی بھی بہت سی کتابیں امانتاً رکھی ہیں۔ کیوں کہ وہ انجمن ہی میں علمی کام کرتے تھے اُن کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ جب چاہیں اپنی کتابیں وہاں سے الگ کرلیں۔

میں ۲۶ سال سے انجمن ترقی اردو کا آنریری سکرٹری ہوں اور اس کا تمام حساب کتاب، مال و زر، کتابیں اور انتظامات میرے ہاتھ میں رہے۔ آج تک کسی نے میری دیانت اور راست کرداری پر شبہ نہیں کیا اور مجھ پر کامل اعتماد کیا۔ لیکن آج اس نئے دور میں میں مشتبہ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر خطاوار سمجھا جاتا ہوں۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ حکومت میں اوپر کے خاص ارکان بہت نیک خیال اور نیک نیت ہیں اور وہ دل سے چاہتے ہیں کہ ملک میں انصاف ہو اور خدمت کرنے والوں سے ہم دردی کی جائے۔ لیکن نیچے کے عمّال جن کے ہاتھ میں اصل اقتدار ہے اُن کا حال بالکل دوسرا ہے۔ خود حکومت کو بھی اس کی شکایت ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ پہلے غیرحکومت میں ہم نہایت آزادی اور اطمینان سے کام کرسکتے تھے اور اب نہیں کرسکتے۔ جب میں ان حالات پر غور کرتا ہوں تو مجھے بڑی مایوسی ہوتی ہے اور اس مایوسی کے عالم میں کبھی کبھی دل میں یہ فاسد خیال گزرتا ہے کہ شاید ابھی ہم اس آزادی کے اہل نہ تھے۔

میں نہایت ادب سے اس طویل خط لکھنے کی معافی چاہتا ہوں۔ خصوصاً ایسے زمانے میں جب کہ آپ کا مزاج ناساز ہے اس قسم کی جرات نازیبا ہے۔ لیکن چوں کہ مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر بے جا بدگمانیاں کی گئی ہیں اس لیے میرا فرض تھا کہ آپ

کو اپنے سرپرست اور رہنما کی حیثیت سے اصل واقعات سے آگاہ کردوں اگر کوئی امر خاطر عالی پر گراں گزرے تو امید ہے کہ آپ ازراہ کرم معاف فرمادیں گے۔ آخر میں میری خلوص دل سے یہ دعا ہے کہ خدائے تعالا آپ کو کامل شفاعطا فرمائے اور تادیر زندہ و سلامت رکھے کہ ہم آپ کے شریفانہ خیالات ، آپ کی صحبت اور آپ کے اخلاق و کردار سے مستفید ہوتے رہیں"۔

خادم

(شرح دستخط) عبدالحق

اس خط کے جواب میں سرتیج بہادر نے مجھے لکھوایا کہ افسوس کہ میں خود خط نہیں لکھ سکتا اور یہ ہدایت فرمائی کہ میں چیف کمشنر صاحب سے مل کر تمام حالات بیان کردوں ۔ وہ بہت منصف مزاج اور شریف النفس انسان ہیں اور اس ملاقات کے نتیجے سے ان کو اطلاع دوں ۔

حسب ہدایت سرتیج بہادر نون کے ذریعہ چیف کمشنر صاحب سے ملنے کی درخواست کی - فرمایا آج فرصت نہیں- کل ؟ کہا کل بھی بہت مصروفیت ہے - پرسوں ؟ فرمایا پرسوں بھی بہت مصروف رہوں گا - بار بار دریافت کرنے پر بہت تامل کے بعد فرمایا " پیر کی صبح "، یہ بھی اُن کے گوش گزار کیا گیا کہ میرے ساتھ کیفی صاحب بھی ہوں گے - پوچھا کیفی صاحب کون ہیں - اُن کا پورا نام بتایا اور کہا کہ یہ انجمن کے ڈائرکٹروں میں سے ہیں انجمن کے بڑے موید و حامی اور اردو کے بہت بڑے ادیب اور شاعر ہیں - (۸ نومبر) کی صبح وقت مقررہ پر چیف کمشنر صاحب کی کوٹھی پر میں اور کیفی صاحب حاضر ہوئے - تقریباً ایک گھنٹہ برآمدے میں بیٹھے انتظار کرتے رہے - ملاقاتیوں کی فہرست میں میرا نام نہ تھا پنڈت جی کا نام تھا گھنٹے بھر کے بعد چپراسی نے آکر پنڈت جی سے کہا - آپ کل ملنے کو آیئے اور ملاقات کا وقت دریافت کرلیجیے گا - ۱۲ نومبر کو کیفی صاحب تشریف لائے - معلوم ہوا کہ انھوں نے دوسرے روز فون سے ملاقات کا وقت دریافت کیا تو جواب ملا کہ اڑھائی بجے فون کرکے دریافت کیجئے- اڑھای بجے فون کیا تو کوئی جواب نہ ملا - خط لکھ کر دریافت کیا اب تک کوئی جواب نہیں دیا - ۱۰ نومبر کو کیفی صاحب سے ملا تو معلوم ہوا کہ اس وقت تک بھی کوئی جواب نہیں آیا اس کے

بعد ۲۲ نومبر کو کیفی صاحب تشریف لائے اور چیف کمشنر صاحب کی ملاقات کا حال بیان کیا اور کہا کہ اب وہ کچھ دھیمے پڑ گئے ہیں۔ اور چیف کمشنر صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ ڈاکٹر ذکر حسین صاحب سے کہیے کہ وہ ان سے ملیں۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب کو پیغام پہنچا دیا غالباً وہ نہیں ملے اور ملنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ یہ ہیں وہ چیف کمشنر جن کی انصاف پسندی اور شرافت کی تعریف سرتیج بہادر نے مجھے لکھی تھی۔ ہمارے آئی سی ایس کی گردن اب تک ویسی ہی اکڑی ہوئی ہے پہلے وہ سوائے انگریز آقا کے کسی کے سامنے نہیں جھکتا تھا۔ اب و انگریز آقا کا قائم مقام ہے سب اس کے سامنے جھکتے ہیں اور وہ کسی کے سامنے نہیں جھکتا انصاف اور شرافت پرانی باتیں ہیں یہ سنت بورژوا ہے۔ آزادی کے بعد ان کی ضرورت نہیں رہی۔

میں نے کلکتہ عبدالرحمن صدیقی کو خط لکھا اور انجمن پر جو گزر رہی تھی اس کی اطلاع دی اور لکھا کہ آپ یہاں آکر ہماری مدد کیجیے۔ چنانچہ وہ ۱۶ دسمبر کو دہلی پہنچ گئے۔ اور انجمن سے متعلق تمام حالات دریافت کرتے رہے۔ اس کے بعد دوسرے ہی روز سے اپنی مہم شروع کی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے ملے اور ان سے ڈپٹی کمشنر کو خط لکھوایا کہ مجلس نظما کے فیصلے کے مطابق انجمن کا کتب خانہ عبدالحق کے حوالہ کردیا جائے۔ ۲۰ دسمبر کو میں اور عبدالرحمن صدیقی کیفی صاحب سے ملنے گئے اور کیفیت سے اطلاع دی۔ ہم جس وقت تانگے میں جارہے تھے تو بازار میں بعض ہندو ہمیں دیکھ کر کہہ رہے تھے کہ دیکھو مسلمان جا رہے ہیں۔ گویا مسلمان کوئی عجیب الخلقت ہیں اور پہلی بار دلی میں آئے ہیں۔ جب ہم واپس خلیق منزل میں آئے اور تانگے سے اتر رہے تھے تو تانگے والے نے کہا کہ جب سے گاندھی جی مارے گئے دلی میں امن ہوگیا۔ یہ سن کر میں حیرت سے تانگے والے کا منہ دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ یہ اس نے کیا بات کہی۔ اس کے بعد عبدالرحمن صدیقی صاحب، رفیع احمد قدوائی صاحب۔ ڈاکٹر تاراچند اور مولانا آزاد سے ملے اور انجمن کے معاملے میں گفتگو کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر بیزار ہوکر ۲۸ دسمبر کو ہوائی جہاز سے بھوپال چلے گئے۔

مجھے سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ پاکستان کے ہائی کمشنر اور ان

کے عملے سے کسی قسم کی مدد نہ ملی - صرف جھوٹے وعدے کرتے رہے - یہ ان کے متعلق عام شکایت تھی- لوگ حیران تھے کہ اس شخص کو ھائی کمشنر کیوں مقرر کیا گیا جو پاکستان سے زیادہ بھارت کا خیرخواہ ہے -

یہ لکھنا بھول گیا کہ جب تک دلی میں رہے سی آئی ڈی کی ہم پر نگرانی رہی بعص اوقات میرے ملازموں کو ستاتے تھے اور پوچھتے تھے کہ آج کل کیا کر رہے ھیں اور کون کون ملنے آتا ہے- اکثر ایک مرد معقول باریش مقطع ملنے آیا کرتے تھے اور اردو سے اور ھمارے کام سے بہت ھمدردی ظاھر کیا کرتے تھے- بڑے چرب زبان تھے - بعد میں معلوم ھوا کہ ان کا تعلق سی آئی ڈی سے ہے -

دلی میں رہ کر ہم نے سب جتن کر کے دیکھ لیا کہ یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی آخر تنگ آ کر اسی میں خیریت دیکھی کہ دلی کو خیر باد کہیں - چنانچہ ۶ جنوری ۱۹۴۹ء کو میں گرانڈ ٹرنک سے بھوپال روانہ ھو گیا - بھوپال پہنچ کر چند روز آرام کیا اور دلی کی کثافت اور کوفت سے نجات پائی - ۱۸ جنوری کو دلی سے رفیق الدین احمد صاحب کا خط آیا کہ میرے ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۸ء کے خط کا جواب چیف کمشنر صاحب نے ۷ جنوری ۱۹۴۹ء کو عنایت فرمایا - شاباش بہت جلد خبر لی - اپنی حکومت ہے جب چاھیں جواب دیں یا نہ بھی دیں - کسی کے غلام نہیں آزاد ھیں -

۲۴ جنوری کو بھوپال سے روانہ ھوکر ۲۵ کی صبح کو بمبئی پہنچا . دو تین روز قیام کر کے بعض احباب سے ملا اور دو ایک کام تھے وہ کئے - آخر ۲۸ جنوری ۱۹۴۹ء کو بمبئی سے یہ شعر پڑھتا ھوا جہاز میں سوار ھوا :-

رخصت اے ھندوستاں اے بوستان بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ھم بدیسی میہماں

یہ جو کہتے ھیں ''شاعری جزویست از پیغمبری،، کبھی کبھی یہ بات سچ ثابت ھوتی ہے - حالی نے یہ شعر ۷۰ سال پہلے لکھا تھا اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ کبھی ایسا وقت آئے گا !

جہاز ساڑھے بارہ بجے کراچی پہنچا - ھوا خانے پر شعیب قریشی صاحب ، سید ھاشمی صاحب ، خان عبداللطیف خاں صاحب اور پیر حسام الدین صاحب ملے - خدا کا لاکھ لاکھ شکر کیا کہ خیروعافیت سے پاکستان پہنچ گیا - اب یہاں نئی مہم کا آغاز ھوگا -